آسٹریلیا آوارگی

سفرنامہ

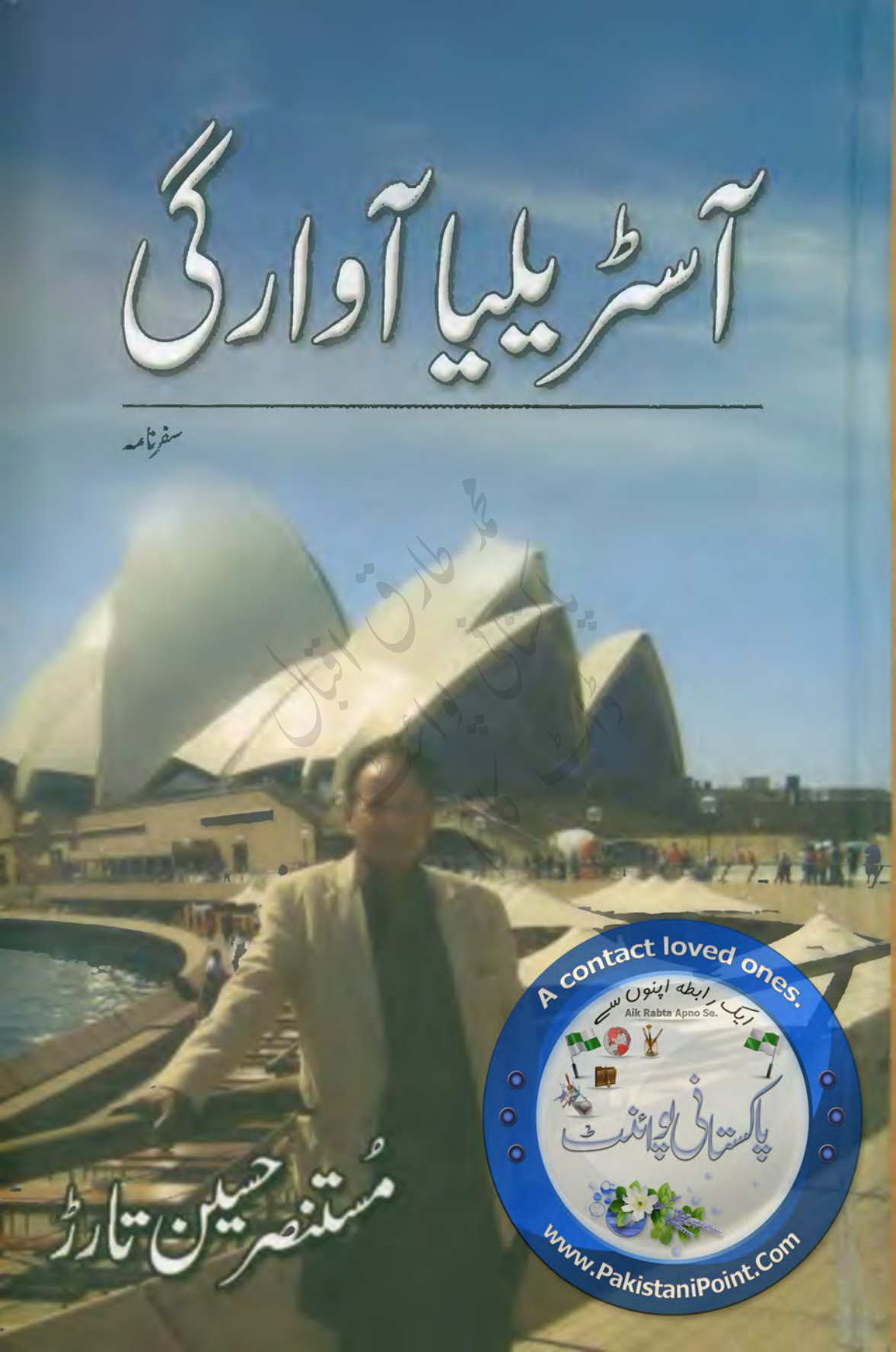

مُستنصر حسین تارڑ

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

آسٹریلیا آوارگی

سفرنامہ

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

مُستنصر حسین تارڑ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

910.4 Tarar, Mustansar Hussain
Australia A'warghi/ Mustansar Hussain Tarar.-Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2016.
188pp.
1. Urdu Literature - Travelogue.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2016ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2847-6
ISBN-13: 978-969-35-2847-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) Lahore-54000 PAKISTAN.
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

خصوصی شکریہ!

جاوید نظر

سلمان اور ڈاکٹر عائشہ

سکھدیپ سنگھ رانگی، رُوپی اور شیرا

شوکت مسلمین، ممبر سڈنی پارلیمنٹ

بیگم و ڈاکٹر سعید خان

اشرف شاد

ریحان علوی اور درخشاں

انتساب

مشال سلجوق، ابراہیم سلجوق
نوفل افتخار، شامیل افتخار

فہرست

1-	''ایک کنگرو۔ایک کوالا ریچھ اور ایک سَت رنگے طوطے کی تلاش میں نکلنا''	9
2-	''مخمل خراب ہونا اور پھر..ہونا مائلِ پرواز جانبِ آسٹریلیا''	17
3-	''کِنگ اینڈ آئی'' کا سیام..بدن بکاؤ ہے..بنکاک''	20
4-	''ایک کنگرو اچھلتا ہوا ہمیں ''ویلکم ٹُو آسٹریلیا'' کہتا ہوا..لیکن یہ تو رائے ونڈ ہے''	24
5-	''ایک اجنبی براعظم کا ہول اور ''گمشدہ نسلیں''	28
6-	''اوئے چودھری مجھے اپریل فُول بناتا ہے''ایک سُکھ دیپ یا دُکھ دیپ''	31
7-	''سِڈنی کی بھیگتی شب میں جاوید نظر..ریحان علوی کا گھر''	35
8-	''نیلے پہاڑوں کا سفر..اور ''گان''افغان یا پنجاب کے اونٹ''	40
9-	''جنگل ایسے گھنے کہ اُن میں طائر اتر نہ سکتے تھے''	44
10-	''بارش میں بھیگتے جنگلوں کی سیاہی میں،ناتمام حسرتوں کے پنچھی''	49
11-	''سڈنی آپرا ہاؤس کی سفید تتلی..اور دیکھنا..''مانن''نام کا بیلے رقص''	52
12-	''ایک لاکھ ساٹھ ہزار مجرموں کا براعظم..جنہوں نے ''وحشیوں کو ملیامیٹ کر دیا''	58
13-	''سڈنی پارلیمنٹ اور شوکت مُسلمین کا ہمارے اعزاز میں ناشتہ''	62
14-	''وولوگانگ..عجیب گانگ..گانگ کی شام اور ضمیر جعفری مسکراتے ہوئے''	67
15-	''اڑتیس برس بعد تہران کے سکھدیپ سے ملاقات..اور وہاں رُوپی تھی،شیرا تھا''	72
16-	''سُکھدیپ کے گھر کی اداسی اور میری محبت میں مبتلا منتظر لوگ''	81
17-	''سڈنی کی تاریخ میں سب سے پرہجوم ادبی تقریب..چہرے فروزاں، آنکھیں آبدیدہ اور ایک زہریلا مکڑا''	84
18-	''واہگرو کی کرپا ہوگئی..جنت کے پرندے ہمارے بیڈروم میں''	90

19- ''سکھ گھرانے میں تمباکو نوشی..سکھدیپ اپنی اداسی سے باہر نہ آتا تھا'' 92

20- ''سمندر ساؤتھ اینڈ کا..کیسپین سمندر اور اب سکھدیپ کے ساتھ آسٹریلیا کا سمندر'' 95

21- ''کینبرا...ہمارا پہلا کنگرو..ڈاکٹر محمد علی کا گھر اور...اس شہر میں میرا بھائی رہتا تھا'' 98

22- ''عرش پر مکاں..ڈاکٹر سعید خان کا مکاں..اشرف شاد اور سڈنی کا سب سے خوبصورت دن'' 106

23- ''اداسی کے سوُروپ..سلمان اور عائشہ کا گھر..احمد اور حسن کا گھر..ہمارا گھر'' 110

24- ''آسٹریلیا کے درمیان میں انانگولوگوں کی سرزمین پر ایک سُرخ چٹان کی جانب ہم پرواز کرتے تھے'' 115

25- ''یُولارا..اولورو چٹان کا بیس کیمپ..ایلس سپرنگ، ساڑھے چار سو کلومیٹر'' 119

26- ''ابورجنل رقاص اور ایک ابورجنل بچہ..کون ہو تم، جو ہماری ہزاروں برس کی تنہائی میں مُخل ہو گئے ہو'' 125

27- ''خاموشی کی آوازیں''..اولورو چٹان پر ڈوبتا سورج..اور سُرخ بادبانوں والی کشتیاں'' 132

28- ''عجیب سودائی کر دینے والا منظر..اور ایک ڈِنگو سے ملاقات'' 137

29- ''صندوقچی میں پوشیدہ ایک تمنا..ڈِنگو چلے جاؤ، یہاں میری نانی جان نہیں ہیں'' 139

30- ''ہم کنگرو اور مگرمچھ کھاتے ہیں..آج چن تارے نیویں لگدے نیں'' 146

31- ''زمین سے پھوٹنے والے بُوٹے جُوتے نہیں پہنتے'' 154

32- ''اولورو چٹان میں سے پھوٹنے والے جھرنے..اور اس کے دامن میں ٹریکنگ...'' 159

33- ''گنگا کے پانی..ایک قدیم تالاب...زمزم کے پانی'' 163

34- کاٹا ٹُو ٹُو کے غروب میں چودھویں کا چاند اُبھرتا ہے'' 169

35- ''میں نے بوڑھے ابورجنل شکاری کو خرید لیا'' 171

36- ''اولورو چٹان پر کرنیں کمندیں ڈالتی اُس کی چوٹی کو سر کرتی ہیں. سورج طلوع ہوتا ہے'' 172

37- ''سُرخ بادبانوں والی کشتیاں پاکستان کی جانب رواں ہوتی ہیں..کون ہو تم؟'' 178

''ایک کنگرو۔ ایک کوالا ریچھ اور ایک سَت رنگے طوطے کی تلاش میں نکلنا''

''میں دیوسائی کا بُھورا ہمالیائی ریچھ ہوں اور میرا نام بِگ بوائے ہے..
میں دیوسائی کا ایک پُھول ہوں اور جیسے میرے رنگ اَن دیکھے ہیں ایسے میرے نام اَن گنت ہیں..
میں دیوسائی کا ایک بادل ہوں جس کی شباہتیں طلسم ہیں، جُھکتی ہیں تو اس میدان پر بچھ جاتی ہیں..
اور میں..خود دیوسائی ہوں، دنیا کا بلند ترین اور وسیع ترین خواب..جس کے اوپر پہنچنے والوں کا سانس بلندی روکتی ہے..
کیا ایک ریچھ کے لیے..ایک پُھول کے لیے..ایک بادل کے لیے گھر سے نکل کر در بدر ہونا جائز ہے؟''

(دیوسائی)

تو کیا ایک کنگرو کے لیے..ایک کوالا ریچھ کے لیے..ایک لامبی دُم والے سَت رنگے طوطے کے لیے..سڈنی آپراہاؤس کی عمارت کے لیے اور اولورو چٹان کے لیے گھر سے نکل کر در بدر ہونا جائز ہے؟
اپنے براعظم سے نکل کر سمندروں میں گھرے ایک اور براعظم تک کا بدن توڑ..طویل مسافت..دن راتوں کا سفر جائز ہے؟
کیا ایک بیہودہ سے اپاہج لگتے دونوں ٹانگوں پر بے مقصد اچھلتے کُودتے جانور کنگرو کو دیکھنے کی خاطر جو ہمہ وقت اپنی پاکٹ میں اپنا بچّہ اٹھائے پھرتا ہے ایک طویل اور پُرصعوبت اور وہ بھی عُمر کی ڈھل چکی شام میں جائز ہے؟..جماقت نہیں تو اور کیا ہے..انسان اگر اس عمر میں کمر باندھے، ایک ایسی کمر جو ٹوٹنے کو ہے اور

اُس کمر کے ساتھ بھی کیا کیا زیادتیاں ہوچکی ہیں تو اسے اگر باندھے تو سُندر بن کے رائل بنگال ٹائیگر کو دیکھنے کی خاطر باندھے..وادیٔ سوخترآباد کی سُرخ چٹانوں میں پوشیدہ کسی سنو ٹائیگر کے دیدار کی خاطر باندھے..محض ایک ابنارمل سے بے حد احمق لگتے بے وجہ اُچھلتے جانور کو دیکھنے کی خاطر کیوں باندھے..صرف اس لیے کہ وہ صرف آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے.حماقت نہیں تو اور کیا ہے..

اور یہ جو کوالا بیئر ہے..یہ بھی کوئی باقاعدہ ریچھ نہیں ہے..کوئی کینیڈین گرزلی بیئر نہیں ہے..ایک خرگوش سا ہے جو درختوں کی شاخوں سے چمٹا اپنی گول گول آنکھیں گھماتا رہتا ہے..جانے اُسے ایک ریچھ کا نام کیوں دیا گیا..ایک درختوں میں رہنے والا بے قاعدہ سا خرگوش کیوں نہ کہا گیا..شائد اس لیے کہ اس براعظم میں شاندار اور باقاعدہ جانوروں کی شدید قلت تھی اور اہل آسٹریلیا شدید کمتری کا شکار تھے چنانچہ اُنہوں نے اس خرگوش کو ریچھ قرار دیا کہ اتنی دُور کس نے آکر اسے دیکھنا ہے تو بس یہی ہمارا ریچھ ہے..دنیا مختصر ہوئی اور باہر کے لوگوں نے آسٹریلیا پہنچ کر اسے دیکھا تو اُنہوں نے آسٹریلیا والوں کا دل دکھانا مناسب نہ جانا،مروّت کے مارے چُپ رہے اور اُسے ریچھ مان لیا..جیسے ہم اہلِ لاہور شملہ پہاڑی کو کے ٹُو قرار دیں تو بلتستان سے آنے والا کوئی شخص آپ کا دل تو نہیں توڑے گا..یہی کہے گا کہ ہاں..یہ کے ٹُو سی تو ہے..تو یہ کوالا بیئر بھی محض اس لیے نامور ہوا،ریچھ ہوا،کہ صرف آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے۔

تو کیا ایک نام نہاد ریچھ کے لیے اتنا طویل سفر جائز ہے؟

بے شک یہ فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے..میرے دونوں بیٹے سلجوق اور سُمیر بنیادی طور پر آرکی ٹیکٹ ہیں اور وہ کیسی حسرت بھری نگاہوں سے مجھے اور میمونہ کو دیکھتے تھے..کہ ہم سمندر میں معلّق ایک بادبانی کشتی کی شکل کے سڈنی آپرا ہاؤس کی عمارت دیکھیں گے..ابّا جی آپ نے اس کے سفید بادبانوں کو ہاتھ لگا کر ہمیں یاد کرنا ہے..روئے زمین پر کوئی اور عمارت ایسی نہیں جو ایک پورے براعظم کی امتیازی پہچان بن گئی ہو۔اور آپ نے سڈنی آپرا ہاؤس کے مرکزی ہال میں کوئی نہ کوئی پرفارمنس دیکھنی ہے،کوئی کھیل،کوئی بیلے رقص،کسی آرکسٹرا کی پرفارمنس..آپ نے دیکھنی ہے..

تو کیا محض سمندروں میں معلّق ایک بادبانی کشتی کی شکل کی عمارت دیکھنے کے لیے،طویل مسافتوں کی صعوبتیں سہنا جائز تھا؟

اور باقی رہ گئی وہ ایک کچھوا نما عجوبہ سُرخ رنگت چٹان جو آسٹریلیا کے براعظم کے عین وسط میں ہموار میدان ویرانوں میں براجمان ہے.جیسے آسمانوں سے گری ہو..یا زمین میں سے برآمد ہوگئی ہو..جس کی رنگت سورج کی پہلی کرنوں میں حیا کی سُرخی ہوجاتی ہے،غروب کے وقت وہ بے حیائی سے دہکنے لگتی ہے تو کیا

میں اپنے شمال کے دنیا بھر میں عظیم ترین چٹانی سلسلوں اور بلندیوں کو بُھول جاؤں، ٹرانگوٹاورز، نانگا پربت کے رُوپل رُخ کے دنیا کی سب سے عمودی چٹان کو بُھول جاؤں..لیکن لے دے کے آسٹریلیا میں یہی ایک چٹان تو رکھی تھی تو موازنہ کیا کرنا..ایک شملہ پہاڑی کا شاہ گوری سے موزانہ کیا کرنا..اُسے بھی دیکھ آنے میں کُچھ حرج تو نہ تھا..لیکن اتنا طویل سفر تو جائز نہ تھا..

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے..

آسٹریلیا میں بھی رکھا کیا ہے..سوائے ڈان بریڈمین کے..نکول کڈمین، رسل کرو، کیتھ ملّر ایسے ہینڈسم کرکٹر کے.. ابورجنل لوگوں کی ساٹھ ہزار برس قدیم حیات کے، بھیڑوں، گائیوں اور ان دنوں آوارہ پھرتے پاکستانی نژاد اونٹوں کے، بے شک وہاں شین وارن ایسا جادوگر باؤلر بھی رہتا تھا جو شکل سے ایک لاہوری ماجھا لگتا تھا اگرچہ ہمارے ماجھے اُس سے کہیں تمیزدار ہوتے ہیں..اور پھر آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم تھی اور وہ بھی بدتمیز اور بہت دہشت گرد مزاج کی حامل.. مجھے کُچھ بُھولتا جاتا ہے لیکن جب پاکستان کرکٹ ٹیم آسٹریلیا گئی تھی تو کسی نے پھبتی کسی تھی کہ یہ لوگ ایک غیر تہذیب یافتہ اور جاہل معاشرے سے آئے ہیں تو ماجد خان نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ..ہماری ٹیم کے نصف ممبر ایسے ہیں جو دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں..ماجد نے اپنے سوا عمران خان کا بھی حوالہ دیا اور پھر پُوچھا کہ آپ کی ٹیم میں کوئی ایک فرد ایسا ہے جو یونیورسٹی کی سطح تک پہنچا ہو۔تو غیر تہذیب یافتہ کون ہے..

ویسے مجھے آسٹریلیا ڈان بریڈمین کے حوالے کے علاوہ بھی دو شخصیات کی نسبت سے عزیز تھا۔

اور ہاں مجھے اپنے عزیز دوست، شاعر اور دانشور..فلم اور تھیٹر کی انسائیکلوپیڈیا، عاشق رسول، جنہوں نے مجھے غارِ حرا میں شب بسر کرنے کی آرزو سے روشناس کروایا، صلاح الدین محمود..وہ کرکٹ کے شیدائی تھے اور ڈان بریڈمین کو کرکٹ کا آخری پیغمبر مانتے تھے۔اُن کے وسیع کتب خانے میں ایک نایاب کتاب تھی، بریڈمین کی حیات کے بارے میں اور اُس کے پہلے صفحے پر کُچھ اس نوعیت کی عبارت بریڈمین کے ہاتھوں کی لکھی درج تھی ''ٹُو صلاح الدین محمود فرام ڈان بریڈمین وِد لَو اینڈ افیکشن۔'' صلاح الدین صاحب نے اُن گئے زمانوں میں بریڈمین کو وہ کتاب برائے آٹوگراف روانہ کی اور گریٹ ڈان نے اُسے دستخط کر کے اُنہیں واپس بھیج دی۔

تو آسٹریلیا..ہم جیسوں کے لیے تب ڈان بریڈمین کے سوا اور کچھ نہ تھا..اور مجھے بہت فخر ہوا کہ جب بریڈمین نے نہایت خاموشی سے اپنی سالگرہ منائی، اگرچہ آسٹریلوی وزیراعظم بھی اُس میں شرکت کے متمنی تھے لیکن اُنہوں نے اپنی سالگرہ پر ذاتی طور پر صرف سچن ٹنڈولکر کو مدعو کیا کہ وہ اُن کے نزدیک اُن سے

بھی بڑا کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔

ویسے تو وہاں میرے دل پر اپنی اداکاری سے بہت اثر انداز ہوتے اداکار رسل کرو..... ''گلے ڈی ایٹر'' اور ''اے بیوٹی فُل مائنڈ'' کے اداکار بھی تھے..اور اُن کے سوانکول کڈمین بھی تھیں جو میرل سٹریپ کی سطح کی عظیم اداکارہ تھیں..صرف ''مالین رُوج''نہیں آپ اُن کی فلم ''دے آور'' دیکھ لیجئے جس میں نکول نے ورجینیا وولف کا کردار یُوں ڈوب کر کیا ہے کہ وہ پہچانی نہیں جاتیں.ورجینیا وولف اگر ایسی نہ تھیں تو اُنہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

خانہ بدوشی یا آوارگی صرف ایک خصلت نہیں، ایک مجبوری، ایک مذہب ہے..اور یہ لوگ مسافتوں اور اجنبی سرزمینوں کے خواب دیکھتے ہیں، گوگل چھان مارتے ہیں، دنیا جہان کی تصویریں دیکھتے ہیں، تاریخ اور جغرافیے کے سمندروں میں غوطہ زن ہوتے ہیں اور اُن میں سے ایک تصوّر کشید کرتے ہیں کہ وہ سرزمین، اُس کے شہر اور منظر ایسے ہوں گے لیکن جب وہ اُن شہروں اور سرزمینوں پر قدم رکھتے ہیں تو اُن کے تمامتر تصوّر باطل ثابت ہو جاتے ہیں، وہ کچھ اور ہوتے ہیں، تصوّر کے کرشموں سے الگ کچھ اور ہوتے ہیں۔

دنیا کا دوسرا سب سے سربلند پہاڑ کے ٹو..جسے میں نے شاہ گوری کا نام دیا جب نظر کے سامنے آتا ہے تو اُس کی سب تصویریں اور حکائتیں باطل ہو جاتی ہیں، وہ آپ کے تصوّر کے جہانوں کے پار ایک اور ہی شکل میں ابھرتا ہے.ایسے سو چہروں والی ''شل مکھی'' نانگا پربت، بلیک فارسٹ، کوہ آرارات، تاج محل قلعہ دراوڑ، کرومبر جھیل، دیوارِ چین، یارقند کے گلی کُوچے، صحرائے تکلا مکان، یہ سب وہم اور تصوّر میں کُچھ اور ہوتے ہیں اور جب نظر کے سامنے آئیں تو وہ منظر کُچھ اور ہوتا ہے۔

جو کچھ تصوّر میں ہوتا ہے وہ اِک فریب ثابت ہوتا ہے۔

آسٹریلیا کے ساتھ بھی یہی معاملات ہو گئے۔

میں نے آج تک ان دیکھی سرزمینوں کو دیکھنے کے جتنے خواب دیکھے تھے اُن میں مجال ہے آسٹریلیا کا کہیں شائبہ بھی ہو..میں کمبوڈیا کے مندروں کے شہر انگکور واٹ..اہرام مصر، ماچو پیچو کے کھنڈر، اینجل فالز، وکٹوریہ آبشار، دریائے ایمزن یا ٹرانس سائبیرین ریلوے اور بیجنگ سے تبت براہ راست جانے والی ٹرین کے خواب تو دیکھتا تھا پر آسٹریلیا...البتہ جب کبھی میں شمال کا سفر اختیار کرتا تو وہ شاہراہ ریشم پر دریائے سندھ کے ایک بلند کنارے کی ویرانگی میں میرے دل میں اداسی بھر دیتا..برسین کا تنہا چار پانچ کمروں پر مشتمل پی ٹی ڈی سی موٹل مجھے ہمیشہ برزبین کی یاد دلاتا..بشام میں سندھ کی سلیٹی چادر کے کناروں پر شب گزار کر اگلی سویر ہم منہ اندھیرے سفر کا آغاز کرتے اور داسو کا پل عبور کر کے عین ناشتے کے وقت برسین میں نازل ہو جاتے..یہ موٹل

ہمیشہ ویران ہوتا، میں نے کبھی وہاں کسی سیّاح کو قیام پذیر نہ دیکھا..موٹل کا عملہ مجھے پہچان کر خوش آمدید کہتا اور ناشتے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا اور میں.. ہمیشہ رُوم نمبر 4 کے اندر چلا جاتا..اور وہاں دریائے سندھ کا شور باہر رہ جاتا، اُس کمرے کے نیم تاریک ماحول میں مجھے عجیب سا سکون محسوس ہوتا، اگرچہ میں آواگون پر یقین نہ رکھتا تھا لیکن..یہ طے تھا کہ میں شائد پچھلی زندگی میں کسی محبوب چہرے کے ساتھ یہاں آیا تھا، میں نے گئے زمانوں میں جو یادداشت سے محو ہو چکے ہیں اس تنہائی میں قیام کیا تھا..اگر ایسا نہ تھا تو پھر کیوں میں ہمیشہ سب سے الگ ہو کر اس کمرے میں چلا آتا تھا..اس کے در و دیوار میں، بستر کی بے شکن چادروں میں یہاں تک کہ غسل خانے میں آویزاں شیشے میں مجھے کسی کی گمشدہ موجودگی محسوس ہوتی تھی..کچھ نہ کچھ تھا جس کی چاہت مجھے یہاں کھینچ لاتی تھی..میں کبھی نہ کبھی تو یہاں سے گزرا تھا۔ وصال کے لمحے اُس کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے..تو آسٹریلیا کا گمان مجھے صرف برسین میں ہوتا..لیکن صرف سال میں ایک بار جب میں شمال کا سفر اختیار کرتا اور ناشتہ کرنے لیے ہمیشہ اسی موٹل میں رُکتا..اور وہاں کمرہ نمبر 4 ہوتا..

چنانچہ مجھے آسٹریلیا سے کچھ رغبت نہ تھی..

وہ میرے کسی خواب یا سراب میں شامل نہ تھا..

میں صرف جاوید نظر کے دن رات کے رابطوں، خواہشوں اور محبتوں میں بندھا چلا جاتا تھا..اُس کے ہاں خالص خلوص کا ایک ایسا جال تھا جو مجھے شکار کرتا تھا..وہ ایسا شاندار شخص لگتا تھا کہ اگر وہ مجھے دوزخ میں بھی مدعو کرتا تو میرے لیے انکار کی گنجائش نہ رہتی ورنہ مجھے آسٹریلیا سے تو کچھ رغبت نہ تھی..

اور پھر کون جاتا ہے لاہور کی گلیاں چھوڑ کر..اور وہ بھی..ایک کنگرو کے لیے..ایک کوالا ریچھ، ایک لامبی دُم والے ست رنگے طوطے، سڈنی آپرا ہاؤس اور ایک سُرخ چٹان کے لیے..

اور یوں بھی اُن دنوں میں تشکر اور تفاخر کے نشے میں مخمور تھا..میرے پڑھنے والوں نے اور مجھ سے ناجائز اُلفت رکھنے والوں نے ملک بھر میں میری پچھترہویں سالگرہ کے موقع پر تقریبات ترتیب دیں، میری سالگرہ کو یوں دھوم دھام سے منایا جیسے یہ میری آخری سالگرہ ہو..اور وہ ہو بھی سکتی ہے۔ یکم مارچ کی سویر ماڈل ٹاؤن پارک کی سویر میں میری آمد سے پہلے میڈیا کے کیمرے نصب ہو چکے تھے، میرے سیر کے دوست چہکتے مجھ سے یوں لپٹتے تھے جیسے آخری بار لپٹ رہے ہوں.. پارک کے مرکزی گیٹ پر ایک بہت بڑا بینر آویزاں تھا جس پر سعید اختر کی بنائی ہوئی میری پورٹریٹ اور صادقین کا بنایا ہوا ''نکلے تری تلاش میں'' کا سرورق نمایاں ہو رہا تھا۔

میں بیان نہیں کرسکتا کہ شکر گزاری نے میری آنکھوں میں کیسے نمی کی نمود کردی۔ عادل، ملک سرفراز، ڈاکٹر نسیم، ڈاکٹر انیس.. شیخ ندیم، قریشی صاحب، فرخ رضوی، عارف ڈوگر، سعید بٹ جیسے نایاب لوگ.. فیض صاحب کی بیٹی منیزہ ہاشمی، عثمان پیرزادہ، عدیل ہاشمی، نورالحسن جیسے پیارے لوگ..

میرا بڑا پوتا یاشار کتنے اعتماد سے جیو ٹیلی ویژن پر اپنا انٹرویو ریکارڈ کروا رہا تھا..

اور ہاں اس تقریب کے سواگت کے لیے اندرون شہر کا ایک بے مثال شہنائی نواز پارک میں نہایت جوش و فروش سے ''بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے'' بجا رہا تھا۔ عدیل ہاشمی نے اپنی اماں جان منیزہ ہاشمی کے کان میں سرگوشی کی ''تارڑ صاحب کا یہ حال بھی ہونا تھا۔''

اُس دوپہر ''ریڈرز ورلڈ'' کے اراکین نے جو کراچی، پشاور، اسلام آباد اور کہاں کہاں سے آئے تھے ایک ہوٹل کی چھت پر میری سالگرہ کا کیک کاٹا اور وہاں ''دھنک'' کے ایڈیٹر سرور سکھیرا اور کہانی کار ذکا الرحمٰن موجود تھے.. ایک کوہ پیما نوجوان نے سکرین پر ایک برفانی بلندی کی تصویر نقش کی.. اُس نے ایک بہت بڑے گلیشیئر پر اپنے ہاتھوں سے.. آئی لو یو تارڑ'' رقم کیا تھا۔

شام ہوئی تو پنجاب آرٹس کونسل کے اراکین چیف منسٹر کا تہنیتی پیغام لے کر آ گئے۔ اپنے ہمراہ کیک کے علاوہ سازندے لے کر آ گئے جو میرے مختصر صحن میں براجمان ہو کر سالگرہ مبارک کی دھنیں چھیڑنے لگے۔ اور پھر 23 مارچ کو علی آڈیٹوریم کے وسیع ہال میں آخری تقریب کا اہتمام ہوا.. اور وہاں میرے بہت سے بھولے بسرے دوست آئے۔ ہال کے داخلے پر میری حیات کی ایک تصویری نمائش ترتیب دی گئی تھی.. سینکڑوں تصویروں میں سے پہلی میں، ایک نیکر پہنے، گول مٹول سانولا سا بچہ ایک سٹول پر بیٹھا ہے، اور آخری تصویر میں ایک بوڑھا اپنی سٹڈی ٹیبل پر جھکا ہوا ہے.. ''ڈان'' کے مطابق ان سب تصاویر میں سے جس تصویر نے قبولِ عام کی سند حاصل کی وہ میری شادی کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر تھی.. ایک زرق برق کمخواب کی شیروانی پہنے میں اور ایک دھان پان، بڑی بڑی آنکھوں والی دراز قامت لکھنوی لگتی مونا..

تقریب کی صدارت کے لیے بہت عرصے سے ''داستان سرائے'' ماڈل ٹاؤن میں روپوش، نہایت علیل بانو قدسیہ.. اُنہیں اُن کی نرس اور سُمیر سہارا دے رہے تھے، چلی آئیں.. ''میں بستر مرگ پر بھی ہوتی تو مستنصر کی سالگرہ پر چلی آتی''.. اور پھر میرے واحد ادیب دوست، چالیس برس سے میرے رازداں اور میں اُن کی محبتوں کا امین، عبداللہ حسین.. وہ بھی چلے آئے.. اگرچہ گنٹھیا کے مارے لڑکھڑاتے سہارے لیتے میرے لیے چلے آئے..

نورالحسن جنہیں بہت سے لوگ میرا بیٹا سمجھتے ہیں کہ اُس نے میزبانی کے میرے ہی انداز اپنا رکھے

ہیں اس تقریب کے میزبان تھے۔۔

آغاز میں سُمیرا اور عینی سٹیج پر آئے، حاضرین کو خوش آمدید کہا اور ظاہر ہے اپنے ابا جی کی خوب خوب تعریفیں کیں، اس فخر کا اظہار کیا کہ وہ میرے بچے ہیں۔

قصہ مختصر۔۔عرفان کھوسٹ نے میرا ایک مزاحیہ کالم ڈرامائی انداز میں پڑھ کر حاضرین کو بہت مسرور کیا۔۔عدیل ہاشمی نے ''بہاؤ'' کا ایک اقتباس پڑھا اور سرمد کھوسٹ نے ''اے غزالِ شب'' کے آخری باب کو زندہ کر دیا۔۔ابرار الحق سٹیج پر آئے اور اُنہوں نے ''تیرے رنگ رنگ'' گا کر محفل کو گرما دیا۔ چونکہ وہ بھی میری طرح ایک جاٹ ہیں تو اُنہوں نے جاٹوں کی توصیف میں ایک ''نچ مجاجن نچ'' کی دُھن پر ایک گیت گایا اور آخر میں سٹیج پر آویزاں میری سعید اختر کی نقش کردہ پورٹریٹ کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگے ''اِک تے پُتّر جٹ دا۔۔تے ایڈی ایڈی اَکھ۔۔ایتھے رکھ''

اس پنجابی اظہار کو اردو میں منتقل کرنا قدرے دشوار ہے۔۔کہہ لیجئے کہ۔۔ایک تو جاٹ سپوت اور پھر اتنی بڑی بڑی آنکھیں۔۔اب اور کیا کہوں''

تقریب کے دوران بار بار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا فون آ رہا تھا کہ مستنصر بھائی میں عیسیٰ خیل گیا ہوا تھا، واپسی پر بارش کی وجہ سے ٹریفک بلاک ہو چکی ہے، میں سرکے بل آؤں گا، میرا انتظار کیجئے۔

تب فریحہ پرویز سٹیج پر آئیں اور بقول کسے اُنہوں نے میلہ لوٹ لیا۔۔وہ صرف ''پتنگ باز سجناں'' کی شہرت پر قناعت نہ کر بیٹھی تھیں، اپنی گائیکی کے سریلے پن سے آسمانوں پر اڑتی پتنگوں سے کہیں آگے اُڑی جاتی تھیں، مجھے سالگرہ مبارک کہنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں ''تارڑ صاحب۔۔آپ نے تو فرمائش نہیں کی تھی لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کی سالگرہ ہو اور میں کچھ گائے بغیر سٹیج پر سے اتر جاؤں۔''

فریحہ نے گایا تو چراغوں میں روشنی نہ رہی۔۔اُس کی گائیکی نے سب چراغ بجھا دیئے اور پھر میری فرمائش پر اُس نے نصرت فتح علی خان کا ''یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے یہ تیری نگاہ کا قصور ہے'' گایا تو مجھ سمیت پورے ہال کو مسخر کر دیا اور میری سالگرہ پر خصوصی طور پر ریکارڈ شدہ پیغامات سکرین پر دکھائے جا رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی، محمد حنیف، منور سعید کے پیغام اور پھر گلزار جو بمبئی سے بات کر رہے تھے اور وہ میرے افسانے ''بابا بگلوس'' سے متاثر ہو کر لکھی جانے والی نظمیں پڑھ رہے تھے جو اُن کے شاعری کے مجموعے ''رات پشمینے کی'' میں شامل ہیں۔

میں نے اپنی تحریروں سے کچھ اقتباس پڑھے اور پھر آخر میں بانو قدسیہ گویا ہوئیں۔۔''پہلے مستنصر مجھے پڑھتا تھا اور اب میں اُسے پڑھتی ہوں۔۔''بہاؤ'' اور ''راکھ'' کو بار بار پڑھتی ہوں۔۔یہ عہد حاضر کا سب سے بڑا

نثر نگار ہے۔ جو لکھتا ہے وہ دوام کے صحیفوں میں درج ہو جاتا ہے۔

بانو آپا بس ایسی ہی ہیں، ایک ذرّے کو آفتاب بنا دیتی ہیں..

عبداللہ حسین نے پرانی رفاقتوں کے قصے چھیڑے..میرے ناول ''بہاؤ'' کا فلیپ لکھنے کے زمانے یاد کئے..یہ قرار ارکیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ قصے، کچھ کہانیاں مستعار لیتے رہتے ہیں..

بے شک میں تو آسٹریلیا کے سفر کو بیان کرنے چلا تھا تو میں نے کیوں اتنی تفصیل سے اپنی سالگرہ کے قصے بیان کیے۔

بے شک ان میں خود نمائی کی ایک خواہش بھی کارفرما تھی لیکن بنیادی طور پر میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یہ وطن اور اس کے باشندے اگر پچاس برس سے..تاریخ ایک ایسی روشنائی سے لکھی جاتی ہے جو نظر نہیں آتی، شاعری آنسوؤں سے لکھی جاتی ہے اور نثر خُون اور پسینے کی آبیاری سے جنم لیتی ہے کے مصداق، یہ وطن اور اس کے باشندے پچاس برس سے آپ کی تخلیقی موجودگی سے غافل نہیں رہتے. اس کی قدر کرتے ہیں، آپ رائیگاں نہیں جاتے، آپ کو اپنی پسندیدگی کے راج سنگھاسن پر بٹھا کر آپ کی قدر و منزلت کرتے ہیں، آپ رائیگاں نہیں جاتے. میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا۔

○○○○○○

''جنجل خراب ہونا اور پھر..ہونا مائلِ پرواز جانبِ آسٹریلیا''

بہت سے جنجال تھے..

اور میں اپنی کاہلی سے مجبور مُنحرف ہو جانے کے بہانے تلاش کرتا تھا..آسٹریلیا کے ویزے کی درخواست کے تقریباً تیس صفحوں میں بس یہ نہیں پوچھا گیا تھا کہ آپ ختنہ شدہ ہیں یا نہیں، اس کے سوا سب کچھ پوچھا گیا تھا..پھر درخواست گذاروں کے ہجوم میں گرمی کی شدت میں ویزا فارم جمع کروانے کی کارروائیاں..ویزا فیس ادا کرنے کے مراحل..اور جب یہ ہفت خواں بالآخر طے ہوئے اور میں منتظر ہوا کہ کسی بھی لمحہ کمپیوٹر سکرین پر مجھے ویزا کی قبولیت کی خبر ملنے والی ہے تو اُدھر سے، سفارت خانے سے دل کو دُکھی کر دینے والا ایک پیغام آیا..آپ چونکہ پچھتر برس کے ہو چکے ہیں اس لیے ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں آپ آسٹریلیا جا کر وہاں انتقال نہ کر جائیں، یا کسی عارضے کا شکار ہو کر کسی بیماری میں مبتلا ہو کر ہم پر بوجھ نہ ہو جائیں اس لیے آپ فلاں کلینک سے اپنا مکمل طبّی معائنہ کروائیں، اگر آپ سو فیصد صحت مند قرار دیئے جائیں گے تب ویزا جاری کیا جائے گا ورنہ..یہیں انتظار فرمائیے، انتقال فرمائیے..

میں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مونا سے کہا ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں ایک کنگرو کو دیکھنے کے لیے اپنا تفصیلی طبّی معائنہ کرواتا پھروں، آج تک نہیں کروایا، اگر کروایا تو جانے کیا کیا نکل آئے، میرے بوڑھے ہو چکے بدن کے اندر جانے کیا کیا خرابیاں ظہور پذیر ہو چکی ہیں..سانس کے تانے بانے کے دھاگے کہاں کہاں اُلجھ چکے ہیں، جانے کونسی رگوں اور شریانوں میں رکاوٹیں ہیں جن سے میں بے خبر ہوں تو میں بے خبر ہی رہنا چاہتا ہوں، دفع کرو آسٹریلیا کو..''

مونا کہنے لگی ''اب اتنے جنجل خوار ہو چکے ہو..تھوڑے سے اور ہو جاؤ..''

اور وہ کہہ سکتی تھی کہ اُسے میڈیکل ٹیسٹ کا سندیسہ نہیں آیا تھا، مجھ سے سات برس کم سِن ہونے کے مزے لوٹتی تھی..

لیکن یہ طبّی معائنہ آسٹریلوی حکومت کے منظور شدہ کلینک میں ایک نہائت خوشگوار تجربہ ثابت ہوا..
وہاں کے انچارج نوجوان اگرچہ باریش ڈاکٹر صاحب نے میرا ''والہانہ استقبال'' کیا، اپنے دفتر میں چائے اور دیگر مشروبات سے خوب پذیرائی کی اور جب اُنہوں نے مجھے کلینک کے دیگر عملے کی تحویل میں دیا تو اُنہوں نے میرا طبّی معائنہ کرنے کے بجائے میری کتابوں پر دستخط ثبت کرنے کی فرمائش کی، میرے ساتھ تصویریں اُتروائیں تب میں نے لیڈی ڈاکٹرز سے درخواست کی کہ اے نیک بیبیو، میں نے اس میڈیکل ٹیسٹ کی فیس کے طور پر خاصی رقم صرف کی ہے تو براہ کرم مجھے کچھ ٹھونک بجا کر دیکھ لو، اُنہوں نے نہ مجھے ٹھونکا اور نہ بجایا.. مجھ سے کچھ اس نوعیت کے سوال پوچھے کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں، میں کہتے کہتے رُک گیا کہ پانچ ہوتے ہیں مبادا وہ مجھے فاتر العقل قرار دیں.. پھر مجھ سے کہا گیا کہ اس کاغذ پر ایک چوکور شکل بنائیں، یہاں بھی جی چاہا کہ مستطیل بنا دوں لیکن اجتناب کیا.. دراصل اُنہوں نے صرف یہ طے کرنا تھا کہ یہ بابا جی کہیں مکمل طور پر بہکے ہوئے تو نہیں ہیں، بلڈ پریشر حیرت انگیز طور پر اُس روز نارمل تھا ورنہ عام طور پر بھٹکتا رہتا ہے، بہرطور یہ ایک مصیبت کی بجائے ایک پکنک ثابت ہوئی، بہرطور وہ ڈاکٹر بچیاں بہت اچھیاں تھیں، یہی قلق رہا کہ اگر وہ مجھے ٹھونک بجا کر دیکھ لیتیں تو اچھا تھا..

اگرچہ دعوت مجھ اکیلے کو آئی تھی لیکن میں نے اپنے ذاتی اخراجات کو بروئے کار لا کر میمونہ کو بھی ہمراہ کر لیا..

چونکہ اس عمر میں ممالک غیر میں کسی ''ہینکی پینکی'' کا امکان مکمل طور پر معدوم ہو چکا تھا اس لیے میں جہاں بھی مدعو ہوتا تھا میمونہ کو ہم رکاب کر لیتا تھا.. کہ اس عمر میں آ کر بہت سے خوف اور خدشے سنپولیوں کی مانند شعور میں سرسرانے لگتے ہیں، کیا پتہ کب کسی ہوٹل کے کمرے میں، وطن سے دُور، سانس کی ڈوری منقطع ہو جائے.. آپ خوابیدگی میں سے باہر نہ آئیں تو وہاں کوئی تو ہو جو خبر کر دے.. کوئی تو پاس ہو.. اسلام آباد میں منعقد ہونے والے آکسفورڈ یونیورسٹی کے لٹریری فیسٹیول کے ایک سیشن میں جب کچھ سوال جواب ہوئے تو ایک ادھیڑ عمر خاتون نے اور وہ میری تحریروں کی حافظ تھیں، جو میں لکھ کر بھول چکا تھا اور وہ فرفر حوالے دیتی تھیں، کہنے لگیں ''ان دنوں آپ کی تحریروں میں ہر جگہ آپ کی بیگم پائی جاتی ہیں جب کہ ماضی میں آپ کے سفرناموں میں نامحرم خواتین پائی جاتی تھیں تو ایسا کیوں ہوا ہے؟''

تو میں نے صرف اتنا کہا کہ ''محترمہ میں اپنی آخری عمر میں اپنی بیگم کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں..''

چنانچہ ہم دونوں اڑے جاتے تھے..

ایک ایسے براعظم کی جانب پرواز کرتے جاتے تھے جسے دیکھنے کی چنداں خواہش نہ تھی، لیکن وہاں

جولوگ تھے، مجھے پڑھنے والے، پسند کرنے والے، جن کی ترجمانی جاوید نظر کرتا تھا، بس اُنہی کی اُلفت کی زنجیروں میں بندھے چلے جاتے تھے..

لاہور سے سڈنی تک پرواز مسلسل نہ تھی..

اُس میں بنکاک کی رکاوٹ تھی..

ہم تھائی ایئر کے مجبور مسافر تھے..ساڑھے چار گھنٹے کی اڑان کے بعد جہاز نے اپنے پر سمیٹ لیے، پرندے نے اپنا وطن دیکھ لیا تھا اور وہ اترنا چاہتا تھا سو وہ ہمارے نہ چاہنے کے باوجود اتر گیا.. بنکاک میں لینڈ کر گیا..

یہاں تین گھنٹے کا قیام تھا..اس قیام کے بعد سڈنی کے لیے کوچ تھا..

oooooo

''کِنگ اینڈ آئی'' کا سیام.. بدن بکاؤ ہے.. بنکاک''

یوں تو تھائی لینڈ کا نام بہ زبان انگریزی خفیف سا جنسی استعارہ تھا کہ ''تھائی'' کی معنویت سے آپ آگاہ ہوں گے اور آپ جانتے ہوں گے کہ اس ملک نے اپنی دھان پان خواتین کے ''تھائیز'' کو مارکٹ کر کے..خوب خوب زرمبادلہ کمایا اور اُس کے بل بوتے پر بے شمار صنعتیں قائم کر کے نہائت خوش حال ہو گیا.. اس ملک کی سب سے بڑی صنعت بدن فروشی تھی اور ہے..شائد اس کی بنیادی وجہ ان کا بُدھ مت پر مکمل یقین ہے کہ اس دنیا میں سو دُکھ ہیں، دوسروں کو سُکھ دو، کبھی انکار نہ کرو.. مجھے تو خواہش کے باوجود اب تک اس سرزمین کے ''تھائیز'' سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملا لیکن شنید ہے کہ یہاں کی خواتین ہر خاص و عام پر پورے بدن سے نچھاور ہو کر فیض یاب یوں کرتی ہیں کہ پُل بنا چاہ بنا فیض کے اسباب بنا کے محاورے میں ان کے فیض کا تذکرہ بھی شامل ہو جاتا ہے..اور ہاں یقیناً اس ''تھائی لینڈ'' میں مرد حضرات بھی تو پائے جاتے ہیں اور وہ اپنی خواتین کو فیض کے اسباب بن جانے میں چنداں مضائقہ نہیں جانتے..

اپنے چاچا جی کے ہمراہ چین کا سفر اختیار کرنے والے مارکو پولو نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ.. ایک روز شاہراہ ریشم پر سفر کرتے، کسی صحرائی وسعت میں مسافت کرتے میں نے محسوس کیا کہ ہمارے قافلے میں جو یورپی سوداگر اور جہاں گرد شامل تھے اُن کے چہرے غیر معمولی طور پر دمکتے اور پُرامید تھے، یہاں تک کہ قافلے کے اونٹ اور گھوڑے بھی بے وجہ ڈکراتے اور ہنہناتے تھے..نوجوان مارکو نہیں جانتا تھا کہ اُن کی مسرت کا سبب کیا تھا..تب وہ سرِشام ایک نخلستانی بستی میں پہنچے جہاں کے باسی اپنے گھروں اور خیموں کے باہر کھڑے تالیاں بجاتے، نعرے لگاتے اُن کا استقبال کرتے تھے اور اُنہوں نے بصد ادب قافلے والوں کو اپنے گھروں اور خیموں میں شب بسر کرنے کی دعوت دی اور وہاں..اُن قیام گاہوں میں اُن کی بہو، بیٹیاں اور بیویاں، اپنے بدنوں میں صحرا کی پیاس بھرے رافیل کی برہنہ تصویروں کے رُوپ میں اُن کی منتظر تھیں..

اگلی سویر وہ جو فیض یاب ہوئے تھے، نہ اُنہوں نے اور نہ ہی یار نے اُنہیں سونے نہ دیا انہوں نے

اُن خواتین کی شبینہ خدمات کے عوض میں اُنہیں اطالیہ کے سافت کردہ شیشے کے جام اور زریں لبادے تحفے کے طور پر پیش کیے..

اور جب اس قافلے نے رخت سفر باندھا..تو بستی کے وہ لوگ اُن کو رخصت کرتے ہوئے اُن پر آوازے کستے تھے، قہقہے لگاتے تھے اور اُن میں فیض یاب ہو چکی خواتین کے قہقہے سب سے بلند تھے اور وہ کہتے تھے ''دیکھو، ان اونٹوں اور گھوڑوں پر وہ احمق سوار ہیں جو یہاں سے کچھ لے کر نہیں گئے، بلکہ ہمیں تحائف کی صورت اتنا کچھ دے گئے ہیں۔''

اہل تھائی لینڈ بھی گویا وہی لوگ ہیں، وہ پُرشوق سیاحوں کو رخصت کرتے دل ہی دل میں اُنہیں احمق گردانتے ہیں کہ یہ یہاں سے کچھ لے کر نہیں گئے، ڈالروں کے پلندے دے کر جا رہے ہیں..کیسے احمق ہیں..

تھائی لینڈ سے میرا تعارف اُنہی زمانوں میں ہوا جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر بطخ ایک راج ہنس دکھائی دیتے ہے..اور میں انگلستان میں تھا..وہاں ویسٹ اینڈ میں ''کنگ اینڈ آئی'' نام کا کھیل سٹیج پر کھیلا جا رہا تھا جو کسی ناول ''اینا اینڈ کنگ آف سیام'' سے ماخوذ تھا..تھائی لینڈ یا قدیم سیام کے بادشاہ کے کردار میں یُل برینر تھا، اپنے گنجے سر سمیت اور ایک برطانوی اُستانی کے رُوپ میں ڈیبرا کر تھی اور یہ وہی اداکارہ تھی جس نے ''ٹی اینڈ سمپتھی'' نام کی فلم میں ٹونی پرکنز پر اپنی برطانوی اخلاقیات کے ڈورے ڈالے تھے..اس کھیل میں گنجے یُل برینر کی اداکاری سے متاثر ہو کر عظیم ہدائت کار سیسل بی ڈی ملز نے جہاں اپنی یادگار فلم ''ٹین کمانڈمنٹس'' میں چارلٹن ہیسٹن کو حضرت موسےٰ کے کردار کے لیے منتخب کیا وہاں یُل برینر کو فرعون کا کردار تفویض کر دیا..اس فلم میں یُل برینر جب کوئی حکم صادر کرتا تھا تو کہتا تھا ''لیٹ اِٹ بی رِٹن سوشل اِٹ بی دَن''، یعنی ''اسے لکھ لیا جائے تاکہ..اس پر عمل کر دیا جائے۔'' تو ہم عہد رفتہ کے قدیمی سیام میں تھے..اور آج کے تھائی لینڈ میں اتر چکے تھے..

بنکاک ایئرپورٹ پر بہت خجل خوار ہوئے..

تھائی ایئر کے پُرکشش اشتہاروں پر مت جایئے جن میں چپٹی ناکوں اور چپٹے سینوں والی دوشیزائیں ہاتھ جوڑتی ہر مسافر کے آگے بچھی بچھی جاتی تھیں، بے شک اُن کے پاس بچھانے کے لیے کچھ سامان نہ تھے..پاکستانی مسافروں کو دیکھ کر تو وہ بچھی بچھی جانے کی بجائے ناگواری سے بُجھی بُجھی جاتی تھیں اور تب مجھے اپنے ملک کی شہزادی پی آئی اے بہت یاد آئی جس نے آج کی بے شمار شاندار ایئر لائنز کو آداب پرواز

سکھائے..جس کی فضائی میزبانوں کے لیے شہرۂ آفاق ڈیزائنر پیرس کے پیئر کارڈین نے ملبوسات ڈیزائن کیے اور تب دنیا کے کسی بھی ایئرپورٹ پر پی آئی اے کی میزبان لڑکی چلتی تھی تو قیامت کی چال چلتی تھی اور سب کی نگاہوں کا مرکز بنتی تھی کہ یہ.. پی آئی اے کی ایئر ہوسٹس ہے..اور پھر اس ادارے کو کرپشن، اقربا پروری اور سیاست لے ڈوبی، ایسی ڈوبی کہ پھر نہ اُبھری..تب اسے دنیا کی بہترین ایئر لائنوں میں لا کھڑا کرنے والے ایئر مارشل اصغر خان اور ایئر مارشل نور خان ایسے ہیرے لوگ تھے..ایک بار پی آئی اے نے جب امریکی جیٹ مسافر بردار طیارے خریدے تو حسب دستور لاکھوں ڈالر کی کمشن اصغر خان کو پیش کی گئی تو اُنہوں نے کہا ''میں یہ کمشن قبول کرتا ہوں لیکن اس رقم کا چیک پی آئی اے کے اکاؤنٹ میں جمع کروایا جائے گا'' اور پھر اس کی سربراہی ایسے لوگوں کے سُپرد کی گئی جو اہل اقتدار کے بُوٹ چاٹنے والے، حرام خور اور نالائق لوگ تھے..اُنہوں نے اس ادارے کو نوچ کھایا، ظاہر ہے اس کی بوٹیاں سیاست دانوں اور نوکر شاہی کے شکم میں بھی اتریں..اُن کے غیر ملکی اکاؤنٹس میں بھی اتریں..

مجھے قلق صرف اس بات کا تھا کہ آخر اس تھائی ایئر کی کیا حیثیت ہے، ایک معمولی ایئر لائن اور تھائی لینڈ پاکستان کے مقابلے میں کیا ہے، ایک دو نمبر بدن فروش ملک لیکن آج ہم مجبور ہیں کہ اس کی پروازوں میں سفر کریں، جیسے ہماری یتیم ہو چکی کرکٹ ٹیم مجبور ہے کہ وہ اپنے ملک کے شاندار میدانوں میں نہیں کھیل سکتی..دربدر ہوتی ہے..شارجہ اور دوبئی میں جا کر کھیلتی ہے..بھلا کوئی بھی ملک جو اپنے حواس میں ہو اپنے مایہ ناز بین الاقوامی کھلاڑیوں کو پاکستان میں کھیلنے کے لیے بھیج سکتا ہے جہاں سری لنکا ایسے پُرامن ملک کی ٹیم پر ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگا کر حملہ کر دیا جاتا ہے، ننگا پربت کے دامن میں خیمہ زن اُن معصوم کوہ پیماؤں کو اسلام کے نام پر ہلاک کر دیا جاتا ہے..پاکستان بلاشبہ لمحۂ موجود میں ''موسٹ ڈینجرس کنٹری اِن دے ورلڈ'' ہے..بہر طور کہاں تک سُنو گے، کہاں تک سناؤں، ہزاروں ہیں شکوے، کیا کیا بتاؤں!

بنکاک ایئرپورٹ کا گیٹ نمبر دس جہاں سے ہم نے سڈنی روانہ ہونے والی پرواز میں سوار ہونا تھا، جہاں ہم اترے وہاں سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا اور ہم دونوں گرتے پڑتے، ایک دوسرے پر گرتے اور دیگر مسافروں پر پڑتے بالآخر وہاں تک پہنچے اور راستے میں کوئی بھی ہمدرد یا دردآشنا نہ ملا جو ہماری راہنمائی کرتا اور وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ سڈنی کی پرواز کے لیے پاکستان سے جاری کردہ ٹکٹ کافی نہیں ہیں، واپس جائیے اور جہاں اترے تھے وہاں سے کسی کاؤنٹر پر سے بورڈنگ کارڈ بنوا کر لائیے..

مونا تو ایک نشست پر ڈھیر ہو گئی..

اور میں اپنے پچھتّر برس گھسیٹتا پھر سے واپس ہوا..بورڈنگ کارڈ حاصل کر کے گیٹ نمبر دس کی

جانب عازم سفر تھا تو ایک مقام پر ''سموکنگ ایریا'' کا نشان نظر آیا.. میں نے ایک دھواں دار کمرے میں ایک سگرٹ کا تمبا کو آخری سلگاہٹ تک خوب پھونکا اور قدرے بحال ہو کر منتظر میمونہ کے پاس پہنچ گیا..

''گڈ مارننگ میڈم..''

وہ چونک گئی اور پھر تھکاوٹ کے باوجود مسکرانے لگی..

ہم دونوں صبح کی سیر کے لیے ماڈل ٹاؤن پارک میں داخل ہوتے ہیں تو اکٹھے سیر نہیں کرتے، میمونہ دائیں جانب چلی جاتی ہے اور میں بائیں جانب ٹریک پر چلنا شروع کر دیتا ہوں اور یہ حکمت عملی میمونہ کی تجویز کردہ تھی کہ.. ہم دن رات اِک دوجے کی شکلیں دیکھ دیکھ کر بیزار ہو چکے ہوتے ہیں تو یہاں بھی ساتھ ساتھ چلنے سے بیزاری میں اضافہ ہوگا تو اُدھر تم اِدھر ہم..اس دوران میرے ایک عزیز دوست شاہ جی جب کبھی سامنے سے آتی اپنی اہلیہ کو دیکھتے تو قریب سے گزرتے کہتے ''گڈ مارننگ میڈم'' میڈم جواب میں مُنہ بسور کر گذر جاتیں تو یہاں بھی وہی ''گڈ مارننگ میڈم'' اگرچہ اُس نے مُنہ نہ بسورا، مسکرا دی..

○○○○○

''ایک کنگرو اُچھلتا ہوا ہمیں ''ویلکم ٹُو آسٹریلیا'' کہتا ہوا..
لیکن یہ تو رائے ونڈ ہے''

آسٹریلیا کی جانب ہمیں لے جانے والا تھائی ایئر کا جہاز ہمیں لاہور سے یہاں تک لے آنے والے جہاز کی نسبت بے حد کشادہ اور پُرتعیش تھا..یعنی مناسب وقفوں کے بعد ایک ایئر ہوسٹس ایک ٹرالی دھکیلتی نشستوں کے درمیان جو گذرگاہ تھی وہاں سے گذرتی، بوتلیں کھڑکھڑاتی، سرگوشیاں کرتی، وائن، بیئر، وہسکی، واڈکا پلیز پکارتی گذر جاتی..کسی اہل شوق کی پکار پر تھم کر اُس کی پیاس بجھانے کے ساماں مہیا کر کے گذرتی جاتی اور یہاں، گراں ہے سب کے لیے مئے لالہ فام کہتے ہیں، والے معاملے بھی نہ تھے بلکہ پیو کہ مفت لگادی ہے خون دل کی کشید کی پیشکش تھی..ویسے اس پرواز میں اہل شوق ذرا کم کم تھے، بیشتر پاکستانی تھے جو اہل شوق میں شامل ہونے کے لیے مرے جاتے تھے لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُنہیں مرتا ہوا کوئی اور پاکستانی دیکھ لے..

ہمارے ''سیر یا گروپ'' کے ایک فرد بلوچ صاحب ہیں، اُنہوں نے آسٹریلیا کے سفر کے بارے میں مجھے کچھ گرانقدر مشورے دیئے کہ اُن کے بیٹے وہاں مقیم تھے اور وہ آتے جاتے رہتے تھے..وہ ایک مؤثر داستان گو ہیں چنانچہ اُن کا کہنا ہے کہ وہاں سڈنی میں اُن کے بیٹے کا ایک ریستوران ہے اور ہر شام ایک موٹا سا انڈین وہاں پچاس ڈالر فی شب کے حساب سے، ایک بڑی پگڑی باندھ کر، ایک مہاراجہ بن کر..ستار بجاتا تھا، بلوچ صاحب بہ ذات خود ایک گلوکار سے ہیں، ہارمونیم اچھا بجاتے ہیں اور جب کبھی بے سُرے ہوتے ہیں ہارمونیم کی کیز کو بے دردی سے چھیڑ کر اتنا بُلند آہنگ کر دیتے ہیں کہ پردہ پوشی ہو جاتی ہے، چنانچہ اُنہوں نے اپنے بیٹے کو پدرانہ شفقت سے نوازتے ہوئے مشورہ دیا کہ بیٹے..کیوں روزانہ پچاس ڈالر اس موٹے انڈین پر برباد کرتے ہو، کل سے میں پگڑی باندھ کر اپنا ہارمونیم بجا کر گا کہوں کو محظوظ کر لوں گا..بقول اُن کے بیٹے نے کہا کہ ابا جی میں نے یہاں بمشکل ایک باعزت مقام اپنے لیے بنایا ہے..تو میری بے عزتی خراب نہ

کیجیے..لوگ کیا کہیں گے کہ اتنی بڑی ساری پگڑی باندھے ایک تخت پوش پر براجمان جو شخص ہارمونیم بجا رہا ہے، گانے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ میرے ابّا جی ہیں.. چنانچہ بلوچ صاحب کو پہلی میسّر پرواز پر پاکستان لوٹا دیا گیا..

تو یہی بلوچ صاحب آسٹریلیا روانگی سے پیشتر مجھے قیمتی مشوروں سے نوازتے ہیں ''بنکاک سے سڈنی جانے والی پرواز میں ایک ایئر ہوسٹس نشستوں کے درمیان میں سے شرابوں بھری ٹرالی شتابی سے دھکیلتی گذر جائے گی، آپ نے چوکنا رہنا ہے کہ کہیں وہ گذر ہی نہ جائے، مجھ پر یہی سانحہ گذر چکا ہے کہ وہ گذر گئی اور پھر واپس نہ آئی..''

جہاز کسی حد تک بے آباد تھا..

چنانچہ ہم نے خالی نشستوں پر پاؤں لمبے کیے، کمبل اوڑھے اور استراحت فرمانے لگے.. نہایت پُرلطف اونگھ میں چلے گئے، روشنیاں بھی مدھم ہو چکی تھیں..بس کبھی کبھار اُس نیم غنودگی میں شرابوں سے مزّین ٹرالی کے گذرنے کی کھڑکھڑاہٹ.. بلکہ جل ترنگ نغمگی سنائی دیتی، شیشے کے سامان کے کھنکتے گیت سنائی دینے لگتے اور اُس نیم غنودگی میں مجھے پرانے زمانوں کے سینما گھروں میں انٹرول کے دوران سوڈا واٹر کی بوتلیں فروخت کرنے، چابی سے بوتلوں پر جل ترنگ بجانے والے تماشائیوں کو ''بوتیل بوتیل'' کے نعروں سے متوجہ کرنے والے یاد آنے لگے..ویسی ہی کھنک تھی..دونوں ہی شیشے کے سامان تھے اگرچہ ایک بوتل میں سوڈا واٹر اُبلتا تھا اور دوسری میں وہ پانی تھے جو صرف بدن کے اندر جا کر شریانوں میں اُبلتے تھے..وہ کیسے معصوم زمانے تھے جب ایک نازنین اپنے محبوب سے فرمائش کرتی تھی کہ ''مینوں سوڈا واٹر لے دے وے، میں روز بالما کہندی'' ناہید اختر اپنی نیم بلوغت کے زمانوں میں یہی گیت گا کر اوج کمال تک پہنچی تھی..لیکن یہ معصوم زمانوں کے قصے ہیں..ان دنوں تو گمان غالب ہے کہ نازنین اپنے بالما کو کہتی ہو گی کہ..مینوں وہسکی سوڈا لے دے وے، میں ردز ڈارلنگ کہندی..

میں نے اپنے تصوّر کے راستے جو آسٹریلیا کی جانب پرواز کرنے کے دوران سوچ رکھے تھے اُن میں یہی نقش تھا کہ ہم بنکاک سے اڑیں گے اور پھر بن پتنگ سمندروں پر ہی اڑتے جائیں گے اور جب نیچے زمین نظر آئے گی تو اُس پر اتر جائیں گے کہ وہ آسٹریلیا ہو گا.. سڈنی کا شہر ہو گا، لیکن سامنے ٹیلی ویژن سکرین پر ہماری پرواز کے تلے سمندر نہ تھے، ویرانے تھے، ہم کب کے سمندر ترک کر کے آسٹریلیا کی وسعتوں پر اڑے جاتے تھے..

میمونہ نے کروٹ بدلی اور نیند کے سُرخ خمار میں گم آنکھیں نیم وا کر کے بولی ''یہ آسٹریلیا کب

آئے گا؟''

''مجھے کیا پتہ کب آئے گا.. میں کیپٹن کُک تو نہیں جو اس کے ساحلوں پر پہلی بار لنگرانداز ہو رہا ہوں.. سو جاؤ..''

اور وہ گویا میرے ''سو جاؤ'' کی ہی منتظر تھی، فوراً سو گئی بلکہ نوزائیدہ نوعیت کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی..

بنکاک سے اڑے ہوئے زمانے گذر چکے تھے.. تقریباً گیارہ گھنٹے کی زندگی کم ہو چکی تھی اور ناریل کے تیل سے تیار کردہ الا بلا کھاتے ہمارا ناک میں دم آ چکا تھا یا دم میں ناک آ چکا تھا کہ اُس کی ناگوار مہک ایسی تھی جیسے آپ معطر اور شاداں ہونے کی خاطر محبوب کی زلفوں کی بلائیں لینے لگیں اور اُس نے اپنے بالوں کو ناریل کے تیل سے چُپڑ رکھا ہو..

جہاز ہچکیاں بھرنے لگا، بلندی کم کرنے کے عمل میں دھچکے کھانے لگا..

''لیڈیز اینڈ جنٹل مَین، ووئی آر اباؤٹ ٹُو لینڈ اِن سڈنی.. کائنڈلی فاسن یوٗر سیٹ بیلٹس..''

نیم غنودگی میں یہ اعلان میرے کانوں میں اترا.. اُس لمحے عجیب سے ہیولے میرے نیم خوابیدہ ذہن میں ابھرتے تھے، ہم سڈنی ایئرپورٹ سے باہر آتے ہیں تو وہاں ہمارے میزبان موجود نہیں ہیں اور ایک بہت بڑے سائز کا کنگرو ہمارے استقبال کے لیے کُودتا چلا آتا ہے ''ویلکم ٹُو آسٹریلیا'' اور حیرت در حیرت اُس کی تھیلی میں ایک کنگرو بچے کی بجائے ایک چھوٹا سا کوالا بیئر اپنی گول گول آنکھیں گھماتا ہے اور کہتا ہے ''میں کینیڈا کا گرزلی بیئر تو نہیں ہوں، ایک منی ایچر ریچھ ہوں اور صرف آسٹریلیا میں پایا جاتا ہوں، تم پہلی بار میرے براعظم میں آئے ہو تو میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں..''

لیکن وہاں سڈنی ایئرپورٹ کے باہر جو رات ہے وہاں نہ کوئی کنگرو تھا اور نہ ہی اُس کی گود میں کوئی کوالا بیئر.. بلکہ جاوید نظر اور ریحان علوی تھے جو شکل سے قطعی طور پر کنگرو یا کوالا نہیں لگتے تھے..

ہم جہاز سے اترے اور شتابی سے پاسپورٹ اور امیگریشن کے فرائض سے سبکدوش کر دیئے گئے، باہر آتے ہیں تو سڈنی میں رات ہے اور اُس رات میں ایک دھیمی پھوار ہے اور اُس پھوار میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سفید داڑھی والے متشرع دکھائی دیتے حضرت ہماری جانب لپکے چلے آتے ہیں..

کہا جاتا ہے کہ ان دنوں متشرع دکھائی دینے والا تازہ ترین فیشن یہ ہے کہ آپ بڑے بھائی کا لمبا کُرتہ زیب تن کر لیجیے اور بہت چھوٹے بھائی کی شلوار پہن لیجیے جو ٹخنوں سے اوپر اوپر ختم ہو جاتی ہے.. سر پر ایک بانسی ٹوپی بھی تو ازن کر لیں تو چار چاند لگ جائیں گے..

اور یہ جو ہماری جانب لپکے چلے آ رہے تھے بس اسی نوعیت کے حضرت تھے..اور اُن کے جلو میں کچھ حجاب پوش خواتین بھی چلی آ رہی تھیں..

''مُونا..'' میں بجا طور پر ہراساں ہو گیا ''یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟ رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں آ گئے ہیں، آؤ فرار ہو جائیں۔''

جتنی دیر میں ہم فرار کے منصوبے کو عملی پاجامہ پہناتے اُنہوں نے ہمارا گھیراؤ کر لیا تھا..خواتین مونا سے لپٹی جاتی تھیں اور وہ حضرت مجھ سے ہم آغوش ہوئے جاتے تھے..

بعد میں کھلا یہ جو جاوید نظر ہے.. ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ والا نظر تھا..اُس کی ظاہری شکل کے اندر ایک شوخ، فراخ دل اور تکلیف دہ حد تک محبت کرنے والا ایک شخص پوشیدہ ہے..جس نے آندھیوں میں چراغ جلائے ہیں، سڈنی میں کوچۂ ثقافت آباد کیا ہے..

موسم سہانے رنگ رنگیلے اور گیلے سے تھے..نم آلود تھے..ایک رم جھم پڑتی پھوار ہمارے تھکن سے چُور چہروں کو تازہ کرتی تھی..

ہم آسٹریلیا میں تھے..

ooooo

''ایک اجنبی براعظم کا ہول اور ''گُمشدہ نسلیں''

ایک سراسر اجنبی شہر کی رات میں ہونا جہاں اَن دیکھے کی کشش دل پہ ڈورے ڈالتی ہے وہاں اُس کے اندر جو کچھ پوشیدہ ہے اُس کا خوف بھی دل میں بھرتی ہے..

اور یہ صرف ایک اجنبی شہر کا ہول نہ تھا بلکہ ایک اجنبی براعظم میں پہلی بار قدم رکھنے کے خدشات تھے جو دامن گیر ہوتے تھے..

کولمبس جب ہندوستان کی تلاش میں امریکہ کے ساحلوں پر جا اُترا اور اسی لیے مقامی باشندوں کو ہندوستانی یا ریڈ انڈین قرار دیا تو اُس کے ذہن میں بھی یہی خدشات تھے کہ میں جہاں بھی آ نکلا ہوں، جس سرزمین کے وجود کا مجھے گمان بھی نہ تھا تو اس پر قدم رکھوں گا تو وہ کہا ہے جو میرا منتظر ہے.. میری مداخلت پر وہ کیا ہے جو میرے مقابلے میں آ جائے گا.. اگر یہاں لوگ ہیں تو کتنے وحشی اور خونخوار ہیں، جانور ہیں تو کونسی نسلوں اور چہروں کے.. صحرا اگر ہیں تو کتنے پیاسے ہیں، یہاں اس اجنبی سرزمین پر جو گُل بُوٹے اور شجر ہیں اُن پر کن موسموں میں بہار آتی ہے، کب خزاں اُنہیں اجاڑ دیتی ہے.. تب کولمبس نے اُس نئی دنیا میں ہزاروں برسوں سے زندگی کرتے شیر دلیر دیوتاؤں ایسے سرخ بدنوں والے گُھڑسواروں کو دیکھا جن کی اپنی تہذیب، اخلاقی اور مذہبی اقدار تھیں اور وہ پُرامن لوگ تھے.. اپنی سرزمین پر قدم رکھنے والے اُن یورپی جہاز رانوں کے چہروں کو دیکھتے تھے کہ کیا ایک انسان اتنا بدصورت بھی ہوسکتا ہے.. بدرنگ سفید چمڑی.. آنکھوں میں حرص اور دولت کی ہوس کی گدلاہٹ.. اور پھر اُن کے چہرے بالوں سے اٹے ہوئے، بے ترتیب داڑھیوں کے جھاڑ جھنکار میں پوشیدہ.. یہ کیسے بدشکل لوگ ہیں جو اپنے چہروں کو صاف نہیں رکھ سکتے کہ آپ نے کبھی کوئی ایسا ریڈ انڈین، بے شک فلموں میں ہی سہی، نہ دیکھا ہوگا جو باریش ہو یا مونچھوں والا ہو.. کہ اُن میں نہ مسلمان ہوتے ہیں اور نہ سکھ..

اُدھر جنوبی امریکہ کے ساحلوں پر لنگر انداز ہونے والے ہسپانوی جہاز راں بھی ایک جھجک کا شکار

ہوئے کہ یہ ہم کہاں آ نکلے ہیں، کہ جہاں ہماری تہذیب سے کہیں برتر اور شاندار اِنکا تہذیب اپنی صدیوں کی روائتوں اور عقیدوں میں گُم..راج کرتی ہے اور ان کے ہاں ہر شے خالص سونے کی ہے..یہ لوگ ہماری طرح کچے برتنوں میں کھانا نہیں کھاتے ،ان کے ہاں سونے اور چاندی کے ظروف ہوتے ہیں..تو اُنہوں نے اپنی تہذیب اور عیسائیت کے نام پر اِنکا تہذیب کو کھنڈر کر ڈالا..اُن کے بادشاہ مار ڈالے،لوگوں کا قتل عام کیا اور اپنے جہاز سونے سے بھر کے ہسپانیہ چلے گئے..

اور یہاں جس سرزمین پر میں نے پہلی بار قدم رکھا تھا یہاں بھی گوری اقوام کے نمائندوں نے قدم رنجہ فرمایا تھا..یہاں کیپٹن کُک صاحب آ نکلے تھے اور لنگر انداز ہونے کے بعد سب سے پہلے صدیوں پُرانے درخت کٹوا دیئے تھے اور پھر مقامی لوگوں کے قتل عام میں مشغول ہو گئے تھے..اور تاریخ کا تسلسل خبر کرتا ہے کہ یہ لوگ پچھلے ساٹھ ہزار برس سے اسی سرزمین پر..ایک سمندروں میں گھرے تنہا براعظم کے ویرانوں میں زندگی کرتے چلے آتے تھے..اگرچہ اُن کی حیات بے حد ابتدائی نوعیت کی تھی..شکار اور پیار..

ان کی شکلیں بھی ابتدائی تھیں، یہ ریڈ انڈین لوگوں کی مانند شاندار پُروجاہت، سُرخی سے دمکتے چہروں والے نہ تھے..وہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتے کسی منزل پر نہ پہنچے تھے..یہ ابورجنل تھے..آسٹریلین بورن اور جنل ..ان پر بھی تہذیب، مذہب اور روشن خیالی کے نام پر مظالم ڈھائے گئے..یہ تو ابھی کل کے الم ناک قصے ہیں جب سرکار کی سرپرستی میں ابورجنل ماؤں سے اُن کے بچے چھین لئے جاتے تھے،اُنہیں اغوا کر کے یا تو گھریلو غلام بنالیا جاتا تھا اور یا پھر کسی مشنری سکول میں داخل کر کے اُنہیں عیسائیت کی تہذیب سے روشناس کروایا جاتا تھا..اور اگر یہ بچے مناسب نہ ہوتے تو انہیں قتل کر دیا جاتا تھا..اور ہاں ماؤں کو اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے چھینے گئے بچوں کو تلاش کر سکیں ،اُنہیں گلے لگا سکیں..یہ تو ابھی کل کا قصہ ہے..

ان ہزاروں ماؤں کی گودوں میں سے چھینے گئے بچوں کو اُن زمانوں میں ''گمشدہ نسلیں'' قرار دیا جا رہا ہے..

ایک شرمندگی اور جُرم کا احساس آسٹریلوی قوم کو بے چین کرتا ہے کہ یہ ہم نے کیا کیا..

چنانچہ پچھلے دنوں آسٹریلیا کے وزیراعظم نے ان ''گمشدہ نسلوں'' پر ڈھائے گئے مظالم پر معافی مانگی ہے،اُنہوں نے اقرار کیا کہ ہم سے ایک گناہ سرزد ہو گیا ہے..ہم توبہ کرتے ہیں..

مجھے یہی خیال آیا کہ کیا آج تک کسی امریکی صدر نے ریڈ انڈین کو ملیا میٹ کرنے ،اُن کا قتل کر کے اُنہیں نابود کرنے کے بارے میں معافی مانگی ہے، کسی کینیڈین وزیراعظم نے اپنی سرزمین پر ہزاروں برس سے آباد مقامی لوگوں سے معذرت کی ہے کہ ہم نے آپ کی دھرتی پر اپنے جدید ہتھیاروں کی مدد سے

قبضہ کرلیا ہے تو ہم شرمندہ ہیں..

صرف آسٹریلوی وزیراعظم اگر ''گمشدہ نسلوں'' کے بارے میں معافی کے خواستگار ہوتے ہیں، اپنے جُرم کا اقرار کرتے ہیں تو یہ اُن کی عظمت کی دلیل ہے..

چنانچہ میں بھی کولمبس اور کیپٹن کُک کی مانند خدشات کا شکار تھا کہ میں کہاں آنکلا ہوں..اس براعظم میں کیسے لوگ ہوں گے، گُل بُوٹے اور پرندے کیسے ہوں گے، البتہ مجھ میں اور کولمبس یا کیپٹن کُک میں ایک فرق تھا، وہ فتح کرنے آئے تھے اور میں مفتوح ہو جانے کے لیے آیا تھا، میرے سامان میں مُہلک ہتھیار نہ تھے، چند کتابیں تھیں..

ہمیں کُچھ خبر نہ تھی کہ ایک اجنبی شہر کی شب میں طویل مسافتوں کی تھکن سے ریزہ ریزہ ہم کہاں جا رہے تھے..

ہمیں اس شب کہاں قیام کرنا تھا..

پھوار تیز ہو چلی تھی اور اب بارش برستی تھی..

ooooo

''اوئے چودھری مجھے اپریل فُول بناتا ہے''

ایک سُکھ دیپ یا دُکھ دیپ''

سکھ دیپ مانتا ہی نہ تھا..

''اوئے چوہدری.. مجھے اپریل فُول بنا رہا ہے.. کہتا ہے کہ میں یکم اپریل کو سِڈنی آ رہا ہوں.. چوہدری اوئے چوہدری، میں نے دارو تو پیا ہے پر اتنا بھی نہیں کہ تُو مجھے بیوقوف بنائے، تو نے کہاں آنا ہے میرے پاس.. اتنے برسوں سے ترلے کر رہا ہوں کہ دم کا کوئی بھروسہ نہیں، آسٹریلیا آ جا، مجھے مل جا، میرے گھر میں ٹھہر.. یہاں ایک سومنگ پُول بھی ہے، تجھے اُس میں ڈبکیاں لگواؤں، یاد ہے جب تہران کی رات میں ہم دونوں کوہ البرز کی چٹانوں کے درمیان سفر کرتے کیسپین سمندر تک پہنچے تھے صرف تجھے اُس میں ڈبکی لگوانے کے لیے.. اور اب یکدم کہہ رہا ہے کہ تو یکم اپریل کو آسٹریلیا پہنچ رہا ہے.. واہگرو کے خالصے کو اپریل فُول بناتا ہے..''

''سکھ دیپ میں واقعی یکم اپریل کو سڈنی آ رہا ہوں.. مذاق نہیں کر رہا.. میرا خیال ہے تُو آج پھر خمار میں ہے..''

''اوئے چوہدری وہ سردار ہی کیا جو خمار میں نہ ہو.. اوئے تجھے یاد ہے ناں وہ سیاہ بالوں والی لڑکی جس کی نظر بڑی کمزور تھی، عینک پہنتی تھی، وہی جس نے انگلینڈ میں مجھے پہلی بار شرابور کیا تھا اور میں وعدے کے مطابق قیمے والے پراٹھے بنا کر آدھی رات کو تمہارے گھر آ گیا تھا اور لینڈ لیڈی نے تجھے نکال دیا تھا.. یاد ہے..''

''سکھ دیپ..'' میں نے اُسے ذرا ڈانٹ کر سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کی ''میں واہگرو کی سونہہ کھاتا ہوں کہ میں یکم اپریل کو سڈنی آ رہا ہوں..''

''اوئے اب واہگر کو بھی اپریل فُول بناتا ہے چوہدری۔'' وہ دھیمے دھیمے ہنسنے لگا۔اور اُس کی مدھم ہنسی میں اداسی کے سائے تھے۔خوشی نہ تھی۔جیسے وہ مجبوراً ہنس رہا ہو۔زندگی کے ڈرامے کے آخری ایکٹ میں لکھا ہو کہ اب تم نے ہنسنا ہے اور سٹیج سے نکل جانا ہے۔وہ دل سے نہیں سکرپٹ کی ڈیمانڈ کے مطابق ہنس رہا تھا۔اور وہ جو گہرے دُکھ اور اداسی کے سائے اُس میں پنہاں تھے وہ میرے دل میں چھید کرتے گئے۔

بے شک اُس کا نام ماں باپ نے سُکھدیپ رکھا لیکن اُس کی زندگی میں سُکھ کا کوئی دیپ نہ جلا۔ اُس نے جتنے دیپ جلائے اُن سب کو درد کی ہواؤں نے بجھا دیا۔اُس کا گھر اجڑتا رہا۔وہ ایک نصیب والا سردار نہ تھا، ایک دُکھ دیپ تھا۔آج سے پچپن برس پیشتر انگلستان کے ساحلی قصبے ساؤتھ اینڈ آن سی میں ہم ایک ڈانسنگ ہال میں ملے اور ملتے ہی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔وہ ہر روز اپنی رنگین پگڑی میں کوئی عام سا شیشہ سجا کر لڑکیوں سے کہتا۔یہ کوہ نور ہیرے کا بچہ ہے۔وہ متاثر تو ہوتیں پر اُس کی قربت سے گریز کرتیں اور تب اُس معنگ لڑکی نے اُسے بالآخر شرابور کر دیا۔میں اُسے آخری مرتبہ آج سے اڑتیس برس پیشتر ''خانہ بدوش'' کے زمانوں میں تہران میں ملا تھا۔

جونہی مجھے اسلام آباد سے آسٹریلوی سفارت خانہ کی جانب سے پیغام ملا کہ مجھے ویزے سے سرفراز کر دیا گیا ہے تو میں نے پہلا فون سُکھدیپ کو کیا اور وہ مانتا ہی نہ تھا۔

اکثر تو نہیں، کبھی کبھار، چار چھ ماہ بعد کسی شب تنہائی میں میرا موبائل فون کُوکنے لگتا، لرزش میں آ جاتا اور دوسری جانب رُوپی بھر جائی ہوتی ''چوہدری جی۔آپ ذرا سُکھدیپ سے بات کرو۔آج دارو بہت پی گئے ہیں اور آپ کو یاد کرتے روتے ہیں۔کہتے ہیں چوہدری میری جوانی کی تریل ہے، شبنم ہے۔پلیز ان سے بات کرلو۔''

اور سُکھدیپ کی بھرائی ہوئی آواز گئے زمانوں میں سفر کر جاتی۔وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو کر ہر اُس لمحے کو یاد کرتا اور روتا جو ہم نے اکٹھے گزارا تھا، اوئے چوہدری یاد ہے تیری جو موٹی ناک والی گرل فرینڈ اینجلا لُولیس ہوتی تھی وہ تم سے خفا ہو کر تمہیں چھوڑ جانا چاہتی تھی، ہم دونوں ساؤتھ اینڈ کی ہائی سٹریٹ میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جوانی کے خمار میں جُھولتے چلتے تھے اور اُس کی کسی سہیلی نے اُسے اطلاع کر دی کہ تمہارا بوائے فرینڈ پاکستانی تو ہو موسیکسوَل ہے۔ایک داڑھی والے لڑکے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اور کبھی اُسے چھیڑتے ہائی سٹریٹ میں چہل قدمی کرتا ہے۔اوئے یاد ہے۔''

مجھے یاد تھا کہ میں نے اینجلا کو بڑی مُشکل سے سمجھایا تھا کہ یہ ہمارے خطّے کا رواج ہے، ہم اپنے

دوستوں کے ساتھ یونہی باہوں میں باہیں ڈالے چلتے ہیں، ہم دونوں ہرگز ہوموہیں ہیں..اگر میں ہوموہوتا تو کیا تمہارے لیے صرف اس لیے ٹینس سیکھتا کہ تم ٹینس کھیلتے ہوئے ایک سی تھروپا آر پار دکھائی دینے والے شارٹس پہنتی ہو..

سُکھدیپ یادوں کی پٹاریاں کھول دیتا..خود بھی روتا اور مجھے بھی رُلاتا..

''چوہدری..اوئے تو نے کہاں میرے پاس آنا ہے..اور سُن تو نے جو شلوکا مجھے بھیجا تھا وہ روپی کی ذاتی عبادت گاہ میں گرنتھ صاحب کے ساتھ رکھا ہے اور وہ ہر سویر جہاں گرنتھ صاحب کو کھولنے سے پیشتر اُسے چُومتی ہے وہاں اُس شلوکے کو بھی بوسہ دیتی ہے..یاد ہے''

بہت برس پیشتر مجھے ننکانہ صاحب کے کچھ پسند کرنے والوں نے مدعو کیا اور اُن میں کچھ سکھ بھی شامل تھے..میں نے گوردوارہ جنم استھان کی زیارت کی، یعنی اُس مقام پر بیٹھا جہاں گورو جی کی پیدائش ہوئی تھی اور ایک سکھ راگی نے ہارمونیم پر بابا فرید کا وہ کلام جو گرنتھ صاحب میں ابد تک محفوظ ہو چکا ہے، پُراثر آواز میں الاپا..اُٹھ فریدا سُتیا، صُبح نماز گذار..اور پھر مجھے ایک چادر یا شلوکے سے سرفراز کیا گیا جو ایک بہت بڑا اعزاز ہے..یہ شلوکا ایک مدت میری سٹڈی میں دُھول جمع کرتا رہا اور پھر سُکھدیپ کا ایک مُسلمان دوست آسٹریلیا سے آیا اور مجھے ملنے آ گیا..میں نے وہ شلوکا اُس کے سُپرد کر دیا کہ اسے میری جانب سے سُکھدیپ کو پیش کر دینا..اس میں اُس کے پیغمبر کی جائے پیدائش کی خوشبو موجود ہے..میں اس کی قدر نہیں کر سکتا..جیسے اگر میرے پیغمبر کی جائے پیدائش اگر ڈھانہ دی جاتی، وہاں ایک لائبریری تعمیر نہ ہوتی، وہی قدیم در و دیوار ہوتے جن کے درمیان میں کائناتوں کے سلطان میرے حضورؐ نے جنم لیا تھا تو اگر وہاں سے مجھے ایک چادر آ جاتی، کالی کملی والے کی جنم بُھومی کی مہک والی ایک چادر آ جاتی تو کیا میں اُسے قرآن پاک کے برابر میں رکھ کر اُسے بوسہ نہ دیتا..

''مجھے یاد ہے سُکھدیپ..اور سُن اوئے سردارا..میں واقعی یکم اپریل کو آ رہا ہوں..تو واہگرو کی سونہہ پر یقین نہیں رکھتا تو میں اپنے اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ بہ شرط زندگی میں سڈنی آ رہا ہوں..''

سُکھدیپ مکمل طور پر قائل تو نہ ہوا پر ذرا موم ہو گیا''چوہدری یہ بتا کہ اب تُو کیسا ہو گیا ہے..ویسے کا ویسا ہے یا عُمر کے ہاتھوں تو بھی میری طرح ذلیل و خوار ہو گیا ہے..''

''سُکھدیپ عُمر کی ڈائن کسی کا لحاظ نہیں کرتی..وہ مجھے بھی کھا رہی ہے، میرے نین نقش بگاڑ رہی ہے..آئینہ دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو نہیں پہچانتا، میں ایک بوڑھا واہیات شکل کا گِدھ ہو چکا ہوں..نہ صرف

آئینے میں اپنے آپ کو نہیں پہچانتا بلکہ اپنے آپ کو دیکھا نہیں جاتا..اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں..''

''نہیں نہیں چوہدری..تُو تو ساؤتھ اینڈ کا ہیرو ہوتا تھا، میمیں ہمیں کہاں دیکھتی تھیں، تجھے دیکھتی تھیں..''

''سکھدیپ وہ میمیں اگر اب تک زندہ ہوں اور مجھے اب دیکھ لیں تو چیخیں مارتی ہوئی بھاگ جائیں، میں قدرے ڈراؤنا ہو چکا ہوں اور تُو کیسا ہے؟''

''میں؟ میری داڑھی کب کی سفید ہو چکی..جُھک کر چلتا ہوں، کُب نکل آیا ہے..پچھلے برس مجھ پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا تو ڈاکٹروں نے شراب کی مناہی کر دی، صرف وائن کی اجازت دی..اور ہدائت کی کہ وائن کا کریٹ نہیں خریدنا صرف ایک بوتل خریدنی ہے..تو میں وائن پیتا ہوں اور پھر جی بہت چاہے تو ایک اور بوتل خریدنے کی خاطر..سینٹ آئیوز کی مارکٹ کے وائن سٹور میں داخل ہوتا ہوں تو سیلز گرلز مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتی ہے کہ یہ سفید داڑھی والا جُھکا جُھکا بوڑھا اپنے آپ میں مسکراتا، وائن کی ایک اور بوتل خریدنے کے لیے آ گیا ہے..تو چوہدری تُو نے کہاں آنا ہے..مجھے اپریل فُول بناتا ہے..''

سکھدیپ نے نہیں ماننا تھا، نہ مانا..آخر میں کہنے لگا''چوہدری، جب میرے سیل فون پر آسٹریلیا کا کوئی مقامی نمبر روشن ہو گا اور تُو بولے گا تب مانوں گا..''

البتہ جب میں نے اپنی کوہ نوردیوں کے ایک رفیق..سنولیک پر گڈیاں اڑانے والے بھالو سلمان سے رابطہ کیا تو وہ فوراً مان گیا..

سلمان نے شادی کے بعد اپنی بیگم ڈاکٹر عائشہ سے کہا تھا کہ مجھ میں دو علتیں ہیں، ایک فوٹو گرافی سے عشق اور دوسری تارڑ زدگی..اگر ان سے سمجھوتہ کر لو تو ہم ایک خوش و خرم زندگی بسر کر سکیں گے..

ان دونوں کے سوا اور کون تھا جو میری ذات کے ہر آئینے میں تصویر ہوتا تھا..کوئی نہ تھا..

اگر تھا تو اپنے زرد پیراہن میں پوشیدہ مجھ سے بے خبر تھا..

○○○○○

''سِڈنی کی بھیگتی شب میں جاوید نظر..ریحان علوی کا گھر''

سڈنی شہر کی بھیگتی شب میں، ہمارے مہربان میزبان کہیں لیے جاتے تھے..
کہاں لیے جاتے تھے، کچھ خبر نہ تھی..

میرے برابر میں جاوید نظر بیٹھے تھے..اور وہ ایک نظر نہ تھے..کم از کم میری معلومات کے مطابق تین نظر تھے..ممتاز شاعر نظر امروہوی کے بیٹے جنہیں لاہور کا تڑکا لگ چکا تھا اور وہ مخدوش سے امروہوی ہو چکے تھے..سو فیصد ''تلیر'' نہ تھے..کچھ کچھ پنجابی ڈھگے بھی ہو چکے تھے..اور ان تینوں میں کوئی بھی قدر مشترک نہ تھی..سب کے سب الگ الگ خصلتوں اور مزاجوں کے..جاوید جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، گھنی سفید ریش کا مالک جس میں ایک آسٹریلوی کراکاٹو نہایت آسانی سے روپوش ہو سکتا تھا، مبلغ، خوش مزاج ہمہ وقت اور خوش کلام ہمیشہ..اور ایاز انجم، مصور، مجسمہ ساز، تھیٹر باز، مسلسل گفتگو کا رسیا..اور پھر اقبال نظر..دھیمے لہجے کا، آنکھوں میں نیلاہٹ کے پرتو، ایک شاعر اور ''کولاژ'' ایسے معتبر ادبی پرچے کا مدیر..یعنی چھوٹے بھائی کُفر کے بُتوں کو پاش پاش کرتے ہیں، منجھلے میاں اُنہی کے ٹکڑے جمع کر کے پھر سے بُت بناتے ہیں، صادقینی طرز خطاطی کے ماہر..یعنی اِن تینوں بھائیوں میں ورائٹی بہت ہے، ایک دوسرے کی سرگرمیوں میں دخل اندازی نہیں کرتے، بُت شکن، بُت تراش، ادب تراش..صد شکر کہ ان میں کوئی طِفل تراش نہیں..یعنی یہ میرا گمان ہے..

شہر سڈنی میں آج رم جھم ہے..جاوید نظر، اُن کے اہل خانہ، ریحان علوی اور اُن کے گھریلو استقبال نے مسافتوں کی سب تھکن رخصت کر دی ہے اور ہم آسٹریلوی طوطوں کی مانند چہکنے لگے ہیں..

جاوید کے کوزی سے گھر میں ایک طعام کا اہتمام تھا، ازاں بعد ہم ریحان علوی کے سُپرد کر دیئے گئے اور وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے..

مُجھے جب کبھی سمندر پار سے کوئی سندیسہ آتا ہے، کوئی بلاوا آتا ہے، میری تحریروں سے اُلفت رکھنے

والوں کا تو میں ہمیشہ گذارش کرتا ہوں کہ مجھے بے شک کسی فائیو سٹار میں نہ سہی وَن سٹار ہوٹل میں ٹھہرا دیجیے، کسی کے گھر میں نہ ٹھہرائیے کہ یُوں ٹھہرنے والا بھی ہمہ وقت چوکنا کہ میاں کسی اور کی خلوت گاہ ہے، لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام..اور اُدھر ٹھہرانے والا بھی مہمان کی مدارات میں باؤلا ہوا جاتا ہے.. یعنی مہمان اور میزبان کی پرائیویسی آداب کی صلیب پر لٹکی ہوئی لیکن محبت کے آگے پرائیویسی کا دَم نکل جاتا ہے..

ہم ''کمرے'' میں داخل ہوئے تو وہ ایک ''کمری'' تھا، قمری نہیں جو چہچہاتی پھرے.. ہمارے میزبانوں کو اندازہ نہ تھا کہ پچھلے بیس پچیس برس سے اس نوعیت کے غیر ملکی دوروں کے دوران ہم ''چوڑ'' ہو چکے تھے..کہہ لیجیے کہ ہماری رہائشی عادتوں کو خراب کر دیا گیا تھا..ماسکو گئے تو صدارتی سویٹ میں قیام.. ہالینڈ میں پاکستانی سفیر کی محل نما رہائش گاہ میں، امریکہ میں حیات ریجنسی، ریاض میں انٹر کانٹی نینٹل، کوپن ہیگن اور برلن میں نفاست اور مختصر پن کی آسائشوں میں..اور پھر ابھی پچھلے برس حکومت چین کی جانب سے سنکیانگ کے سرکاری سفر کے دوران..وغیرہ وغیرہ..ریحان اور درخشاں، دو نہائت معصوم روحیں..ہم دونوں کے آگے خوش آمدیدی سُرخ قالین کی مانند بچھے جاتے تھے..

ہم ''کمرے'' میں داخل ہوئے تو میمونہ نے مجھے دیکھا اور میں نے میمونہ کو، کہ اب کیا کریں..اس میں جو سُتھرا بستر آراستہ تھا وہ تقریباً پورے کمرے کے جغرافیے پر محیط تھا چنانچہ پہلے میمونہ اُس پر چڑھ گئی اور پھر میں ذرا سے تردد اور تگ و دو کے بعد اُس کے برابر میں دراز ہو گیا..اور ہمیں دم روک کے سونا تھا کہ کروٹ کی گنجائش نہ تھی..

یہاں تک تو خیریت گذری لیکن واش رُوم کمرے کے باہر اگرچہ عین سامنے تھا..اور صرف وہ لوگ جو ستر سے تجاوز کر چکے ہیں واش رُوم کی قُربت کی افادیت سے آگاہ ہیں کہ خوابیدگی کے دوران کسی دباؤ کو محسوس کرتے اٹھنا اور پھر کمرے کے اندر اس سہولتِ غسل خانہ کا نہ ہونا، باہر جا کر تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مار کر اُسے دریافت کرنا ایک عذاب ہے.. بابا لوگ کا کیا پتہ کہ کب دم نکل جائے اور کب غسل خانے کی تلاش میں سب کُچھ نکل جائے..

اُس شب کبھی 'مونا مجھ پر آ گرتی اور میں کروٹ بدلتا تو بستر سے گرنے لگتا..اگرچہ مدتوں بعد یہ معجزہ ظہور پذیر ہو رہا تھا کہ وہ مجھ پر اور میں اُس پر گرتا تھا لیکن اب ایسا وقوعہ ثمر آور نہ رہا تھا بلکہ بیزاری اور بیکاری کا باعث بن رہا تھا..شنید ہے کہ نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے..تو ہمیں بھی آ گئی..میں نیند کی چوکھٹ پر تادیر دستک دیتا رہا اور جب غنودگی کے عالم میں وہ خواب سے دروازے کُھلے..کُھل گئے غم کے دروازے، اِک ذرا

سی ہوا کے چلتے ہی..تو میں ایک دُھندلے سناٹے میں داخل ہو گیا.. کُچھ دیر خاموشی رہی، اور پھر پرندے بولنے لگے..لمبی دُموں والے رنگ رنگ کے نخریلے سجیلے پرندے جو میرے نیم خوابیدہ بدن کے جنگل میں کبھی اس شجر سے اڑان کرتے اور کسی دوسرے درخت کی شاخوں میں روپوش ہو کر غُل کرنے لگتے..گیت گانے، چہکنے لگتے..چُپ نہ ہوتے تھے..

ابھی پچھلے دنوں سمندر کنارے، کراچی لٹریری فیسٹیول میں میرے ساتھ ایک خصوصی نشست کے لیے ''تارڑ کی تحریروں میں، پانی، پرندے اور موت'' کا عنوان طے کیا گیا تھا..اور میں نے وہاں اقرار کیا کہ ہاں میرے ناولوں اور سفرناموں میں پنجاب کے دریاؤں کے پانی ہیں بلکہ کب کے خشک ہو چکے دریائے سرسوتی کے پانی بھی بہاؤ میں ہیں اور موت سے بھی مجھے کُچھ گریز نہیں کہ میں متعدد بار اس کے ذائقے سے آشنا ہوا اپنی کوہ نوردی کے دوران اور چونکہ اوپر والے پوسٹ ماسٹر نے اپنے ڈاکیے کے ہاتھ وہ خط نہ بھیجا تھا جس میں میرے لیے سیاہ روشنائی میں میری موت کا فرمان ہو تو میں ابھی تک تھا..اور یہ جو پرندے سڈنی کی شب میں میرے بدن کے نیم خوابیدہ جنگل کے شجروں میں پوشیدہ غُل کرتے تھے یہ سب کہیں وہ تو نہ تھے جو کبھی ''منطق الطیر'' میں سے پھڑ پھڑاتے ہوئے برآمد ہوتے تھے، عطار کے پرندے تھے جو سچ کی تلاش میں نکلے تو سات وادیوں کو پار کرتے کُچھ جل مرے.. کُچھ اجل میں اترے اور کُچھ برفوں میں ٹھٹھر کر مُردہ ہو گئے..ان میں یقیناً وہ ایک پرندہ بھی شامل تھا جو میری آسٹریلیا کی پہلی شب میں پیاس کا مارا پرواز کرتا فریاد کرتا تھا اور یہ وہی تھا جو اُس جھیل پر آ گرا جہاں پرندے مرنے کے لیے آتے تھے اور پاروشنی نے اُسے اٹھا کر کہا تھا ''تم بھی یہاں مرنے کے لیے آ گئے ہو..''

البتہ اُن نیم غنودگی کے خوابوں میں کوئی مُرغابی ظاہر نہ ہوتی تھی..

شائد اس لئے کہ چار مُرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا..

اُس نیم غنودگی میں کبھی شائبہ ہوتا کہ میرے پہلو میں مُونا نہیں، کوئی کراکا ٹُو ہے جو پھڑ پھڑاتا ہے، سراسر سرسوں کے رنگوں میں رنگا ہوا، اُس کی لامبی دُم اُن لامبی اُنگلیوں کی مانند تھیں اور وہ میرے دل کو گرفت میں لیتی تھی اور وہ کراکا ٹُو سوال کرتا تھا، کہ اے سراپا بدن کے زوال میں ڈھے چکے بوڑھے شخص، تیرے ہاتھوں میں تو کیا کہیں بھی جُنبش نہیں ہے صرف آنکھوں میں دم ہے تو کیوں اتنی طویل مسافتیں طے کر کے یہاں آ گئے ہو..تمہاری عُمر در بدر ہونے کی نہیں اپنے در پر پڑا رہنے کی ہے..ابھی تک مبتلا ہو، کیوں آ گئے ہو..

شب بھر رہا چرچا ترا..

اور پھر یکدم سکوت ہو گیا..وہ پرندہ سرسوں رنگت کا پھڑ پھڑاتا بھی نہ تھا، میں کچھ دیر کے لئے نیند کی عارضی موت کے اندر اتر گیا..ایک ایسے تابوت میں دفن ہو گیا جو سیاہ نہ تھا، سرسوں کی رنگت کا تھا..

سویر، کھڑکی کے پردوں میں سے سرائت کرتی کمرے کو روشن کر رہی تھی.. مُونا بے سُدھ اوندھی پڑی تھی..

جاگو جاگو موہن پیارے..

میمونہ نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور مسکرانے لگی

''جاگ گئی..''

درخشاں نام کی، ریحان کی سادہ طبیعت بھولی سی بیگم، کچن اور ڈائننگ روم کے درمیان بھاگتی پھرتی تھی، ہمارے لئے ناشتے کے بندوبست کرتی پھرتی تھی..تردد کرتی باؤلی ہوئی پھرتی تھی تو ہم کمرے کی تنگدستی کو بُھول گئے..اُس کی مہمان نوازی کی دوڑ دھوپ کے اسیر ہو گئے..یعنی..ہم بُھول گئے ہر بات.. پر تیرا پیار نہیں بُھولے..

''کیا آپ آرام سے سوئے..؟'' ریحان نے پُوچھا..

اور میں اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اس لیے کہا..''نہیں..''

وہ دونوں اس ''نہیں'' کے ردعمل میں ایک صدمے کی کیفیت میں چلے گئے، اتنے فکرمند ہوئے کہ ہمیں اُن پر ترس آنے لگا..اور جب میں نے کہیں اور منتقل ہو جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو ریحان کہنے لگا ''ویسے ہمیں خدشہ تھا کہ شائد وہ کمرہ آپ کے لیے قدرے مختصر ہے تو ہم نے آج کی شب کے لئے آپ کے لئے اپنا ذاتی بیڈروم خالی کر دیا ہے..کہیں نہ جائیے، پلیز ہمارے ہاں رہ جائیے..''

ہم اُن کی جانثاری اور محبت کے مزید اسیر ہو گئے..

''ویسے جب منیزہ ہاشمی براڈ کاسٹنگ کی ایک کانفرنس کے سلسلے میں سڈنی آئی تھیں، تو اُنہوں نے کئی روز تک اسی کمرے میں قیام کیا تھا..'' درخشاں کہنے لگیں..میرا شک یقین میں بدل گیا کہ منیزہ واقعی ایک صُوفی رُوح ہے، اگر اُس نے فیض کی لاڈلی نے کئی روز تک اُس زنداں نامے میں شکائت کئے بغیر کئی روز گذارے تھے تو وہ یقیناً ایک ملامتی درویش تھی.. مجھے پہلے ہی شک تھا..

اُن دونوں نے ہمیں لاہوری جان کر ناشتے کا وسیع اہتمام کیا تھا لیکن وہ ہمارے ایک ٹوسٹ اور

ایک انڈے پر قناعت کرنے سے از حد مایوس ہوئے..

شفیق الرحمٰن کے ایک سکاٹ پروفیسر کے بقول..ناشتے کے بعد صُبح کا پہلا سگرٹ ہی زندگی کی کشید ہے، بقیہ دن تو بیکار اور فضول گذرتا ہے.. چنانچہ میں سڈنی کی پہلی سویر میں ناشتے کے بعد کا پہلا سگرٹ پینے کی خاطر ریحان کے گھر کے پچھواڑے میں چلا گیا جسے شائد وہ پائیں باغ کہتے ہوں گے..

دھوپ سر بلند درختوں کی شاخوں پر کُچھ دیر کے لیے ٹھہری ہوئی تھی اور اُن کے اندر شائد رات کے سوئے ہوئے پنچھی ابھی ابھی بیدار ہوئے تھے، چہک رہے تھے..ان شجروں میں کوئی تو پرندہ ایسا ہوگا جو صرف مُجھے آسٹریلیا میں خوش آمدید کہنے کے لیے کُوکتا ہوگا..

اے پوشیدہ پرندے تُو کون ہے اور تیری کُوک میں اتنا ملال کیوں ہے..کبھی تو سامنے آ، اپنا مُکھ دِکھلا..تیرے رنگ کیسے ہیں، تو کون ہے..اپنی چھب دِکھلا..تُو بھی تو عطار کے پرندوں کی مانند سچ کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا..تو آج اگر سچ تمہارے سامنے ہے تو تُو بھی سامنے تو آ، کیوں پوشیدگی میں جدائی کے ملال میں کُوکتا چلا جاتا ہے..

○○○○○

''نیلے پہاڑوں کا سفر..اور''گان''افغان یا پنجاب کے اونٹ''

یہ ہم تھے جو نیلے پہاڑوں کی جانب سفر کرتے تھے..

سڈنی سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ''بلو ماؤنٹینز'' دیکھنے کو جاتے تھے جہاں شنید تھی کہ جنگل اتنے گھنے ہیں کہ پرندے اُن میں آشیانے نہیں بناتے، بنا بھی لیتے تو اُن کی گھناوٹ ایسی ہے کہ اُس میں اُلجھ کر اپنے آشیانے کا رستہ بُھول جاتے ہیں..گھناوٹ میں اُلجھ کر پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں وہ جنگل اتنے گھنے ہیں..اور مُجھے یہ بھی خبر کی گئی تھی کہ وہاں پاکستان کے ٹرنیگو ٹاورز کی بناوٹ کی تین چٹانی بہنیں ہیں جو اُن نیلے جنگلوں کی پاسبانی کرتی ہیں، کسی کو بھی اُن کے اندر اترنے کی اجازت نہیں دیتیں کہ اگر کوئی کوہ نورد اپنی آوارگی کے جنون میں اُن کے اندر چلا جائے وہ اُن کی نیلاہٹ کی تاریکی میں موت میں بھی اتر سکتا ہے..میں نیلے پہاڑوں کے سوا اُن تینوں بہنوں کو ملنے کے لیے بھی چلا جاتا تھا..اور میں اُن سے ملاقات کو تنہا تو نہ جاتا تھا، جاوید نظر کی سفید ریش سٹیئرنگ سے اُلجھتی تھی، سڈنی میں آمد کے بعد وہ مسلسل مجھ پر ایک نظرِ کرم رکھتا تھا..کبھی کسی ہندوستانی، پاکستانی، لبنانی، چینی، جاپانی، تھائی ریستوران میں کھلاتا پلاتا تھا..بلکہ صرف کھلاتا تھا، پلاتا نہیں تھا، اگرچہ وہ پلاتا تو میں کہاں پینے والا تھا، اُس کے سوا اُس کے برادر بزرگ انجم نیاز بھی ہم رکاب تھے..اور وہ بھی عجیب سے بزرگ تھے، مسلسل اور وہ بھی اپنے کمالات کے بارے میں بولنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے..صادقین کے مقابلے میں دیگر پاکستانی مصوروں کو ہیچ جانتے تھے کہ وہ اُن کے پیروکار رہے تھے..اور جب میں نے اُنہیں صادقین کے بارے میں اپنی یاریوں کے بارے میں بتایا اور اُن کو اطلاع کی کہ اُنہوں نے جو سب سے پہلی اردو کتاب مصور کی، اُس کا سرورق بنایا..خاکے تخلیق کیے اور میری پورٹریٹ تصویر کی وہ ''نکلے تری تلاش میں'' تھی تو انجم تب میرے گرویدہ ہو گئے...ویسے جب وہ چُپ ہو جاتے تو محسوس ہوتا کہ پورا آسٹریلیا چُپ ہو گیا ہے بلکہ آسٹریلوی طوطے بھی منقارزیرِ پر ہو گئے ہیں..آسٹریلیا میں اُن کے مداحین کی کمی نہ تھی، وہ آتے جاتے رہتے تھے، آتے تھے اور پھر جانے کا نام نہ لیتے تھے..اگر میں آج سے پیشتر اُن

کے نام سے واقف نہ تھا تو یہ صریحاً میرا گھامڑ پن تھا، میں خسارے میں چلا آتا تھا..

جاوید نظر آسٹریلیا کے طول وعرض میں سفر کر چکا تھا، مجھے شک ہے کہ وہ آئرز راک یا اولورو چٹان کی قربت میں جو ابورجنل لوگ ہیں وہ وہاں تبلیغ کے لیے بھی جا چکا ہے..اُس نے مجھے بتایا کہ پچھلی صدی میں آسٹریلیا کے ویرانوں اور صحراؤں میں سفر کرتے گھوڑے دم توڑ دیتے تھے، ہوائی جہاز یا موٹر کاریں ابھی ایجاد نہ ہوئی تھیں تو سلطنت برطانیہ نے جو آسٹریلیا کے علاوہ ہندوستان پر بھی راج کرتی تھی، ہندوستان سے نقل وحمل کے واسطے کئی سو اونٹ درآمد کرنے کا فیصلہ کیا..ان کے ہمراہ اونٹوں والے بھی چلے آئے جو مسلمان تھے، اُنہیں افغان یا گان کہا گیا، یہ اونٹوں والے ظاہر ہے آسٹریلیا آئے تو واپس نہ گئے یہیں آباد ہو گئے، کچھ نے گوریوں سے اور کچھ نے ابورجنل عورتوں سے شادیاں کر لیں، ایلس سپرنگ میں اب بھی دو تین کُوچے اُن مسلمانوں کے نام سے موسوم ہیں..سڈنی سے چلنے والی ایک مشہور زرین کا نام ''گان ایکسپریس'' ہے..

یہاں پر ایک تاریخی مغالطے کا ازالہ ضروری ہے..

یہ لوگ دراصل افغان نہ تھے..ایک تحقیق کے مطابق سرائیکی علاقے کے تھے، کچھ سرگودھا شہر کے تھے اور بیشتر بلوچ قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے..اُن زمانوں کے آسٹریلیا میں کئی ماہ کی سمندری مسافت جھیل کر آنے والے وہ پگڑیوں والے، اُن کے نزدیک وحشی سے اونٹوں والے بس افغان تھے..

پچھلے دنوں جب میری ''ریڈرز ورلڈ'' کے اراکین نے اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں مجھ سے ملاقات کا اہتمام کیا تو میرے لیے سب سے بڑی سرپرائز یہ تھی کہ وہاں کوئٹہ ٹیلی ویژن کے سب سے زرخیز ذہن کے پروڈیوسر اس محفل میں سُن گُن پا کر چلے آئے اور یقین کیجئے کہ اُنہوں نے ایسے ایسے شاندار سیریل پروڈیوس کئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے..بلوچستان کے ویرانوں میں قدیم لبادوں کے گھڑسوار چلے جاتے ہیں اور ایک عقاب اُن کے سروں پر اُڑان کرتا چلا جاتا ہے..

وہ اخباروں وغیرہ سے جان چکے تھے کہ میں آسٹریلیا گیا تھا، کہنے لگے ''تارڑ صاحب میں ایک نہایت عجیب فلم کی منصوبہ بندی کر رہا ہوں..وہ اونٹوں والے جو پچھلی صدی میں اپنے اونٹوں کے ہمراہ آسٹریلیا گئے اور وہاں کے صحراؤں میں سفر کیا، ویرانوں میں قصبے آباد کئے اور میں نے ابھی پچھلے ماہ ایک بلوچ خاندان کو دریافت کیا ہے اور اُن کے پاس پوری تاریخ ہے کہ کیسے اُن کے آباؤ اجداد اور وہ اُن کا پورا شجرہ نسب بیان کرتے ہیں، اُن بزرگوں کے نام بیان کرتے ہیں جو اپنے اونٹوں کے ساتھ سمندری جہازوں میں کئی ماہ کے سفر کے بعد آسٹریلیا پہنچے تھے، میں ان اونٹوں والوں کے بارے میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں.. مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب جدید ذرائع نقل وحمل ایجاد ہو گئے تو اونٹ بیکار ہو گئے..اُنہیں ویرانوں میں چھوڑ دیا گیا جہاں وہ

کثیر تعداد میں ہو گئے..اتنے ہو گئے کہ کنگروؤں کی مانند انہیں ہلاک کرنا پڑا..اور پھر کسی لبنانی آسٹریلوی نے صلاح دی کہ انہیں بیکار ہلاک نہ کرو..انہیں ذبح کر کے، حلال کر کے عرب حضرات کو برآمد کر دو جو اس کے گوشت اور دودھ کو مقدس جانتے ہیں..کیا آپ اس فلم کی سکرپٹ میرے لئے تحریر کریں گے..''

میں جانتا ہوں کہ وہ ایک خواب دیکھنے والا اُن پر یقین کرنے والا ایک تصوراتی شخص ہے..اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ واقعی ایک ایسی فلم بنا ڈالے گا تو میں اپنے آپ کو اس کی سکرپٹ کے لیے وقف کر دیتا..

ہم چلے جاتے تھے..نیلے پہاڑوں کی جانب!

ابھی یہ پچھلی شب تھی جب جاوید کے ہاں کھانے پر ایک پُرانے شُعلے..اولڈ فلیم، یعنی عظمیٰ گیلانی سے ملاقات ہو گئی..وہی بے دھڑک ہنسی، گہری جنسی آواز، کینسر ایسی موذی بیماری کو پچھاڑ دینے والی باہمت عورت..لیکن وہ پُرانا شعلہ بجھ چکا تھا، وہ زمانے جب روحی بانو اور طاہرہ نقوی کے ہمراہ عظمیٰ ٹیلی ویژن سکرین پر راج کرتی تھی، وہ زمانے گذر چکے تھے..میں نے بھی اپنی اداکاری کے زمانوں میں عظمیٰ کے ہمراہ اداکاری کے ''جوہر'' دکھائے تھے..ہم دونوں نے پچھلے زمانوں کو یاد کیا اور اُن زمانوں کے اُن لوگوں کو یاد کیا جو ہم سے بچھڑ چکے تھے اور بہت اداس اور آبدیدہ ہو گئے..

عظمیٰ نے کوچۂ ثقافت کی تقریب کی میزبانی کرنی تھی تو ہم دونوں نے تفصیل سے یہ طے کیا کہ اس تقریب کی ترتیب کیا ہو..

عظمیٰ گمشدہ شہرت کی پرچھائیوں میں گمنامی میں اترتی تھی..وہ شکائت کرتی تھی، گئے زمانوں کے لیے ترستی تھی..

ٹیلی ویژن کی عارضی شہرت کہاں تک آپ کا ساتھ دے سکتی ہے..وہ کبھی نہ کبھی تو ہرجائی ہو جاتی ہے..

اور وہ سڈنی میں ہرجائی ہو چکی تھی..یہاں کون تھا جو عظمیٰ گیلانی کی عظمت رفتہ کی پہچان رکھتا تھا..کوئی نہ تھا..

عظمیٰ کی خواہش تھی کہ وہ صرف میرے پروگرام کی میزبانی نہ کرے بلکہ سٹیج پر کوئی کہانی ڈرامائی انداز میں پڑھ کر اپنی اداکاری کے جوہر پر سے زنگ اُتارے..اُس نے اس سلسلے میں اسد محمد خان اور قدرت اللہ شہاب کی کہانیوں کا چناؤ بھی کر رکھا تھا..بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا..

عظمیٰ شکوے بہت کرتی تھی..زمانے کا بُل ڈوزر میری طرح اُسے بھی روند چکا تھا..اور وہ مفاہمت نہ کر سکتی تھی..شہرت اور ناموری کے وہی رات دن مانگتی تھی..اور شہرت..میڈیا کی شہرت تو ایک فلیش کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی ایک لمحے کی چکا چوند روشنی ہے..اُس لمحے کے بعد آپ پچھتاوے کے اندھیاروں میں اتر جاتے ہیں، مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے..دور کیا جانا اور تفصیل میں کیا جانا، آہو چشم راگنی جس کی آنکھیں پورے ہندوستان کے دلوں پر راج کرتی تھیں، سہگل کی ہیروئن، کبھی ملکہ عالیہ اور کبھی ہندوستان کی شہزادی..الوہی حُسن کی مالک..میرے گھر کے سامنے جو مکہ کالونی نام کی کچی آبادی ہے، اُس کے ایک تنگ کمرے میں مر گئی..میں سوچتا ہی رہا کہ اُس ہرنی کی آنکھوں والی بوڑھی عورت کے پاس چلا جاؤں اور کچھ وقت عقیدت اور محبت میں اُس کے ساتھ گذاروں..میں سوچتا ہی رہا اور وہ مر گئی..اُس کے جنازے میں درجن بھر لوگ ہوں گے..تو پھر..میرے اور عظمیٰ جیسے محدود صلاحیت کے محدود ناموری کے لوگ کس شمار قطار میں ہیں..

یوں بھی جب آپ اپنے وطن کو ترک کرتے ہیں تو گویا اپنے ماضی کو بھی ترک کرتے ہیں..وہاں کسی محفل میں جایئے تو کوئی نہ کوئی بوڑھا دل تھام کر آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جائے گا کہ..آہا عظمیٰ گیلانی یا تارڑ صاحب..اور یہاں دیارِ غیر میں..میں روز ادھر سے گذرتا ہوں تو کون دیکھتا ہے اور پھر..نہ گذروں گا تو کون دیکھے گا..کوئی بھی نہیں..

چنانچہ اگر میرا سُند رہنا شہرت کا بیت گیا..تو شکائتیں کیا اور گلے شکوے کیوں..جو بیت گیا سو بیت گیا..سب مایا ہے..

ooooo

''جنگل ایسے گھنے کہ اُن میں طائر اُتر نہ سکتے تھے''

دور دور تک افق کے پار بھی کسی نیلاہٹ کا شائبہ تک نہ تھا اور اس کے باوجود ہم بلو ماؤنٹینز کی جانب سفر کرتے جاتے تھے..

پھر کسی مقام پر ہم شاہراہ سے الگ ہو کر ایک خاموش گڑیا گھروں والے نہایت سوہنے قصبے میں داخل ہو گئے اور اُس لمحے شائد نیلے پہاڑوں نے ہمیں خوش آمدید کہنے کی خاطر ایک پھوار کی رم جھم روانہ کی جو ونڈ سکرین پر جل ترنگ بجانے لگی.. قصبے کے باغ، باغیچے اور بہت پھول اور بہت گھنی جھاڑیاں اس پھوار میں بھیگنے لگیں.. یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پھوار زمین کی کوکھ تک سرائت کرتی ہے اور اُس میں سے ابھی ہماری نظروں کے سامنے گُل بُوٹے پھوٹ رہے ہیں.. اور وہاں ہم ہی نہ تھے جو نیلے پہاڑوں کی زیارت کے لئے چلے آتے تھے.. سینکڑوں سیاّح نیلے پہاڑوں کے گھنے جنگلوں کی بلندی پر تعمیر شدہ ایک وسیع پلیٹ فارم کی ریلنگ پر جُھکے اپنے سامنے پھیلے ایک کائنات، ایک وسیع گھناوٹ، سرسبز اور نیلاہٹ میں ڈوبے ہوئے منظر پر آنکھیں رکھتے تھے، اُن آنکھوں کو اٹھاتے تھے تو اُن میں نیلے پہاڑوں کا نیل گُھلا ہوتا تھا..

جنگلوں کے لاکھوں شجر ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو رہے تھے.. ہر درخت برابر کے درخت میں اُلجھا ہوا. تو یہاں پرندے کیسے آشیانے بناتے، وہ ان کے اندر داخل ہو سکتے تو تنکوں سے اپنا آشیانہ تعمیر کرتے..

مُجھے یقین ہے کہ اگر تریوی فوارّے کی مانند یہاں بھی میں اُن گھنے نیلے جنگلوں کی جانب ایک سکّہ اُچھالتا تو وہ اُن کی شاخوں، پتّوں اور بیلوں کے گھنے پن میں سے گذر کر جنگل کے فرش پر نہ گرتا، وہ جنگل کی گھناوٹ کی ہری چھت پر ہی پڑا رہ جاتا.. دور سے دکھائی دیتا رہتا..

اور یہاں ان گھنے جنگلوں کی چوکھٹ پر پہلو بہ پہلو بلند ہوتی تین خوش نظر چٹانیں تھیں جنہیں تین بہنیں کہا جاتا تھا..

اور وہ ان جنگلوں کی نگہبان تھیں...

جانے کیوں یہاں شائد جاوید نظر کی مذہبی قربت کی وجہ سے وہ قصہ یاد آ گیا جب جماعت اسلامی میں اُن دنوں ایک ممتاز عُہدے پر فائز پراچہ صاحب سے پُوچھا گیا تھا کہ حضرت شادی کرنے کا بھی کچھ ارادہ ہے کہ نہیں تو اُنہوں نے کہا تھا کہ بے شک..ایک بہن کے لئے رشتہ مانگا ہوا ہے، دیکھئے کیا جواب آتا ہے.. یاد رہے کہ جماعت کے کارکن ایک دوسرے کو بھائی اور بہن کے لقب سے پکارتے ہیں..شُنید ہے.

تو کیا جانئے ان تین بہنوں کے لئے بھی شائد بھائیوں کے رشتے آئے ہوں..

ان بہنوں کی قربت حاصل کرنے کے لیے گھاٹی کی خطرناکیوں میں ایک مخدوش سا راستہ دکھائی دے رہا تھا..اور اُن تینوں کو آپس میں ملانے والا ایک پُل بھی گر چکا تھا..تو ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے..اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایسی ناقابلِ حصول بہنیں اگر کنواری رہ جائیں تو اس میں قصور بھائیوں کا تو نہ ہوگا..

چٹانوں کا موازنہ کرنا بیکار ہے بلکہ بے وقوفی ہے.. پہاڑوں کی سلطنت کے دیوتاؤں کے سب تخت پاکستانی شمال میں بچھے ہیں اور جتنی بھی دنیا بھر کی چٹانی بلندیاں ہیں وہ سب پاکستان کے سینے سے ابھرتی ہیں..دنیا کی سب سے سربلند برفانی چٹانی دیوار نانگا پربت کے رُوپل رُخ میں سے اٹھتی ہے..اور پھر وہاں نرنگوٹاورز نام کی چٹانیں ہیں جنہیں سر کرنا، اُن پر چڑھنا، ہر کوہ نورد، ہر چٹانوں سے چمٹ کر چوٹی تک پہنچنے والے شخص کا خواب ہیں.. یوں جانئے کہ ٹرنگوٹاورز پہاڑوں کی سلطنت کے چٹانی عقاب ہیں جب کہ یہ تین بہنیں اُن کے مقابلے میں چُوں چُوں کرنے والی چڑیاں ہیں..بے شک چڑیاں ہیں لیکن ان کی دل کشی میں کچھ کلام نہیں، یہ دل میں آشیانے بنا کر چہکتی ہیں..

ویسے اس براعظم میں قدم رکھنے سے پیشتر میرے تصوّر میں ویرانے، بیاباں، کنگرو اور کچھ شہر سمندر کنارے تھے، پر ایسے سربلند نیلے پہاڑ اور گھنے جنگل تو نہ تھے..پس ثابت ہوا کہ نہ تصوّر پر ایمان لاؤ، نہ گمان پر دھیان دو کہ یہ سب واہمے اور فریب ہیں..گماں کچھ اور ہوتا ہے اور نظر آتا ہے کچھ اور..اور جب ہم نے جی بھر کے نیلے پہاڑوں کے منظر، اُن کے دامن میں گھنے ہوتے جنگلوں اور تین بہنوں کو دیکھ لیا، ایک سوونیئر شاپ سے اپنے بچّوں کے لیے کوالا بیئر، خرگوش، کنگرو اور مزید کنگرو خرید لئے تو پارکنگ لاٹ میں منتظر جاوید نظر سے کہا ''اب گھر چلیں؟''

کبھی کبھار میرے گھر کی گھنٹی بجتی ہے اور باہر آ کر گیٹ کھولتا ہوں تو وہاں تقریباً نصف درجن کے قریب نوجوان، نیم نوجوان اور کچھ میری عُمر کو پہنچے ہوئے باریش، ٹخنوں سے اوپر آتی چھوٹے بھائیوں کی شلواریں اور بڑے بھائیوں کے کُرتے پہنے مسکراتے ہوئے لوگ موجود ہوتے ہیں..مجھ سے معذرت کرتے

ہیں کہ تارڑ صاحب آپ کو زحمت تو ہوئی ہوگی صرف ایک گذارش کرنا چاہتے ہیں اور پھر اُن میں سے کوئی ایک رٹی رٹائی گذارش کرنے لگتا ہے.. میں وہ گذارش اتنی بار سُن چکا ہوں کہ وہ مجھے ازبر ہو چکی ہے، نماز روزے کی تلقین کی جاتی ہے، جنت کی نوید دی جاتی ہے اور جہنم کے عذاب سے روشناس کروایا جاتا ہے اور میں نہائت تحمل سے اُن کی یہ تقریر سنتا ہوں کہ وہ دیگر مذہبی لوگوں کی مانند نہ عبادتوں کے تکبّر میں آپ کو حقیر جانتے ہیں اور نہ ہی آپ پر دھونس جماتے ہیں یا تعمیرِ مسجد کے لیے دھمکی آمیز ''درخواست'' کرتے ہیں.. بلکہ ایک بار اُن میں سے ایک نوجوان مبلغ نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر نہائت عقیدت سے میری اُنگلیوں کو بوسے دینے لگا کہ.. حضور آپ نے تو ''غارِ حرا میں ایک رات'' لکھی ہے.. بعدازاں وہ مجھے مغرب کی نماز کے لئے نزدیکی مسجد میں مدعو کرتے ہیں اور میں چشم دید گواہ ہوں کہ وہ مسجد امریکہ میں مقیم ایک بیوہ خاتون کے پلاٹ پر ایک مذہبی جماعت کی معاونت سے غیر قانونی طور پر رات بھر میں تعمیر کر دی گئی تھی.. جہاں ان دنوں ایک مدرسہ قائم ہے جس میں تعلیم پانے والے کچھ ''باغی'' طالب علموں کو زنجیروں سے باندھ دیا جاتا ہے.. تو جاوید نظر بھی اُسی قبیلے کے لوگوں میں سے تھا، نہایت مؤدب، انکسار پسند، دھیمے مزاج والا، دھونس پسند نہ تھا، درخواست گذار رہتا تھا تو اُس نے میرے ''اب گھر چلیں'' کے جواب میں اپنی شلوار جو ٹخنوں کو روپوش کرنے والی تھی، اڑس کر اوپر کیا اور کہنے لگا ''تارڑ صاحب، بھابھی اور آپ سے درخواست ہے کہ ابھی آپ گھر نہیں جائیں گے، ابھی تو آپ نیلے پہاڑوں کی پہنائیوں میں اتریں گے، ایک کیبل کار میں سوار ہو کر ان جنگلوں کے پار جائیں گے، بارش کے جنگلوں کے اندر جو پرندے بسیرا کرتے ہیں وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے اڑان کریں گے، دنیا کی سب سے عمودی ٹرین کے مسافر ہوں گے، آپ کے پاؤں تلے آبشاریں ہوں گی اور آپ.. جنگلوں میں کھو جائیں گے.. ابھی آپ کہاں جائیں گے..''

جنگلوں میں گُم ہو جائیں گے.. اس خیال نے مجھ پر جادو کر دیا.. سبحان اللہ.. کیا پتہ یہاں بھی ''یاک سرائے'' کی کوہ نوردی کے درمیان میں پڑنے والا کوئی ایسا جنگلی ہو جس کی ڈال ڈال اور پات پات پر لامحی ست رنگی دُموں والے پرندے اُڑانیں بھرتے ہوں تو گم ہو جانا چاہئے..

اور کیا پتہ.. ہم تم ایک جنگل میں گم ہوں اور شیر آ جائے.. تو گم ہو کر دیکھتے ہیں.. اور یہ جو پُرانے زمانے کا ایک بے حد پسندیدہ گیت تھا کہ.. ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے.. اور اک جنگل میں گم ہوں اور شیر آ جائے.. اس لئے بھی یاد آیا اور مجھے مسکرانے پر مجبور کیا کہ سلجوق اُن دنوں شائد دوسری یا تیسری کلاس میں کیتھڈرل سکول میں پڑھا کرتا تھا اور جب کبھی لکشمی مینشن کے ہمارے فلیٹ کے واحد، تنگ اور تاریک غسل خانے میں جاتا تھا تو اپنے ڈر کو زائل کرنے کی خاطر بلند آواز میں گانے لگتا تھا ''ہم تُم اِک

کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے..'' 1975ء میں ''خانہ بدوش'' کے زمانوں میں جب میں گھر سے نکلا، پہلی شب کابل کے ایک ایسے ہوٹل میں آئی جہاں میرے کمرے کے برابر میں جو کمرہ تھا وہاں ایک جرمن ٹورسٹ کی لاش پڑی تھی تو اُس شب نیچے بازار کے کسی قہوہ خانے میں سے موسیقی اور گیت مدھم آوازوں میں میرے کانوں میں اترنے لگے کہ..ہم تم اِک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے..اور میں سلجوق کے لئے اتنا اداس ہوا کہ واپسی کا فیصلہ کرلیا..اگلی سویر اداسی قدرے زائل ہوگئی اور میں ہرات جانے والی اُس بس میں سوار ہوگیا جس میں میرے علاوہ صرف روئی کی گانٹھیں سفر کرتی تھیں..

تو ہم تم اِک جنگل میں گُم ہوں..

اور اُس جنگل میں گم ہونے کے لئے ہم ایک ایسی کیبل کار میں سوار ہوئے جس کا فرش شیشے کا تھا اور جب وہ رینگتی بلندی کی جانب اٹھتی تھی تو ہمارے قدموں تلے گھنے جنگل پائمال ہوتے تھے..آس پاس چٹانوں کے سلسلے بلند ہوتے تھے..حیرتوں کے بلند اور پُرشکوہ سامان آس پاس گذرتے جاتے تھے اور پھر اُن چٹانوں میں سے متعدد آبشاریں پھوٹنے لگیں جن کے پانی ایک شالیمار باغ کے تختوں کی مانند درجہ بہ درجہ چٹانوں سے اترتے، تالاب تخلیق کرتے، پھر اُن تالابوں میں سے راہ بناتے پھوٹتے گہرائی میں گرتے جاتے تھے، یہ ''کاٹوم، کاٹومبا'' آبشاروں کے سلسلے تھے اور یقیناً یہ نام ہزاروں برس قدیم تھا، آسٹریلیا کے اصل حقداروں نے اسے اس نام سے پکارا تھا..میمونہ شیشے کے فرش پر کھڑی کیبل کار کے تلے گہرائی میں سرکتے منظروں کو تکتی تھی اور جب یہ آبشاریں اُس کے جوگرز تلے ظاہر ہوئیں تو وہ جھجک گئی کہ کہیں اُس کی شلوار کے پائینچے آبشاروں کے پانیوں سے بھیگ نہ جائیں..

یہ خوش پھوار اور خوش آبشار نظارے بالکل چُپ تھے، پانی شور نہ کرتے تھے، وہ ہمارے قدموں تلے ایک خاموش فلم کے منظر کی مانند گذرتے جاتے تھے کہ کیبل کار کے کیپسول میں اُن کے پُرشور تلاطم داخل نہ ہو سکتے تھے..

سکائی وے ایسٹ سٹیشن کی چوٹی پر کیبل کار جا ٹھہری، جا معلّق ہوئی..ہم اترے..ایک ایسی بُلندی پر جا اترے جہاں دُھند کی سفید روئی آوارگی اِٹھلاتی پھرتی تھی، اور اس کے درمیان میں ایک پہاڑی راستہ اٹھتا چلا جاتا تھا اور ہم دونوں جیسے ٹیلی ویژن کے کسی ایڈونچر پروگرام میں شامل ہونے والے ایسے ساتھی ہوں جنہوں نے ایک طے شدہ وقت کے اندر اندر منزل پر پہنچنا ہو..ایک ہیجان میں تھے، تیز تیز چلتے تھے، ہمیں خبردار کر دیا گیا تھا کہ آخری کیبل کار یہاں سے پورے پندرہ منٹ کے بعد نیچے وادی میں اتر جائے گی اور جو مسافر سوار نہ ہو سکے گا وہ پھر کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر..اگلی سویر آنے والی کیبل کار کا دراز انتظار

کرے۔اگر وہ اس بلندی پر بغیر کسی چھت یا گرم پہناوے کے کُھلے آسمان تلے زندہ رہ جائے..

تو ہم بھاگے پھرتے تھے..

اُس پہاڑی راستے کے آخر میں ایک بلند مقام تھا جہاں سے نیلے پہاڑوں کے جنگلوں کی کُل کائنات آنکھوں کے سامنے بچھی نظر آتی تھی، یہ ایک ہوش ربا منظر تھا..اُس پہاڑی پگڈنڈی کا ایک ایسا نقش تھا جو میری یاد میں ثبت ہو چکا ہے..میں نے اُس راستے کے کناروں پر ایک عجیب سے پتّوں والی جھاڑی دیکھی اور بناوٹ ایسی تھی کہ ہر پتّے پر ایک آنکھ کا گمان ہوتا تھا..میں اُسے قریب سے دیکھنے کے لئے ڈھلوان پر چڑھا تو میرے جوگر گیلی سُرخ مٹّی میں ثبت ہو گئے تو میں نے مُونا سے کہا''ہمارے بعد کوئی سیّاح اِدھر آئے گا اور وہ حیران ہوگا کہ یہ کس کے قدموں کے نشان ہیں، جس کے بھی ہیں، وہ کیوں طے شدہ راستے سے الگ ہو کر اس ڈھلوان پر چڑھا تھا اور وہ نہیں جانے گا کہ وہ ایک ایسی جھاڑی کے پتّوں کو دیکھنے کی خاطر بے راہرو ہوا تھا جن پر آنکھیں ثبت تھیں..کیونکہ وہ آنکھیں اُسے نہیں دکھائی دیں گی..''

''مجھے بھی دکھائی نہیں دیتیں..'' مُونا نے میرا تمسخر نہیں اڑایا بلکہ ایک مسکراہٹ لبوں پر لا کر کہا..کہ وہ میرے دل کی محرم ہو چکی تھی، جانتی تھی کہ مجھے وہ کچھ دکھائی دے جاتا ہے جو ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے وہ مجھے دکھائی نہیں دیتا..ہم عین وقت پر آخری کیبل کار پر سوار ہوئے اور پھر سے واپس وادی کے گھنے جنگلوں میں اتر گئے..

اور وہاں پاتال میں پہنچے تو ایک ٹرین ہماری آمد کی منتظر تھی اور اُس کی تین بوگیاں عجیب لڑھکتی ہوئی حالت میں تھیں''خواتین وحضرات کمر کس کر بیٹھئے گا..ہراساں ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے..آپ دنیا کی سب سے بڑی ڈھلوان ریلوے لائن پر لڑھکنے والے ہیں، آج تک کوئی حادثہ نہیں ہوا..جو شائد آج ہو جائے پر ہراساں نہ ہو جایئے، کمر کس لیجئے..''

میمونہ اپنی کمر اور میں نے اپنا''کمرہ''کَس لیا جو ایک مُدت سے چربی کی ایک بوڑھی تہہ میں روپوش ہو کر کمر سے کمرہ ہو چکا تھا..

اور جب وہ ٹرین چلی تو گویا یکدم گری..ایک پاتال میں اتری نہیں گری..ایک ایسی پاتال جس کے بارے میں فہمیدہ ریاض نے کہا تھا کہ..تم اپنی زباں میرے مُنہ میں ڈالے، جیسے پاتال سے میری جاں کھینچتے ہو..ایسے گری..

لیکن یہ پل دو پل کا کھیل تھا..ابھی سوار ہوئے اور یکدم پاتال میں دھڑام سے جا گرے اور سفر اختتام ہو گیا..

○○○○○

''بارش میں بھیگتے جنگلوں کی سیاہی میں
ناتمام حسرتوں کے پنچھی''

اور تب ان نیلے پہاڑوں کے اندر جو جنگل در جنگل ہلکی پھوار میں بھیگتے تاریک ہوتے تھے اور ہم اُن کے پاتال میں جا گرے تھے اور اُنہوں نے ہمیں اپنے بھید بھرے نیم اندھیاروں میں روپوش کر لیا.. وہاں جتنے بھی درجنوں اقسام کے شجر تھے، جھاڑیاں اور گیلی مٹی میں سے پھوٹنے والے بُوٹے اور روئیدگی تھی ہم نے کبھی پہلے تو نہ دیکھے تھے، لگتا تھا جیسے والٹ ڈزنی کی کوئی کارٹون فلم ہے جس میں عجیب جادوئی جنگل نظر نواز ہو رہے ہیں.. جیسے ''آوتار'' فلم کے منظر ہوں جنہیں صرف تخیل کے زور پر تخلیق کیا گیا تھا اور اُن میں وہ لامسی دُموں والے انسان عجیب سے پرندوں پر سوار اڑان کرتے ہوں.. یہ ایسے عجیب جنگل تھے جن میں ہم دونوں طے شدہ راستے پر حیران اور ڈرتے ہوئے چلتے تھے، یکدم سناٹے میں کوئی پرندہ کُوکتا تو ہم ٹھٹھک جاتے، ہمیں پتہ نہ تھا کہ نیلے پہاڑوں کے اندر ان جنگلوں میں جو پرندے پائے جاتے ہیں، وہ بھی کسی سامری جادوگر نے تخلیق کئے ہوں گے..

ہم جب اُس دھم سے گر جانے والی ٹرین سے اترے تھے تو اطلاع کی گئی تھی کہ ان جنگلوں کے پاتال میں سے آخری کیبل کار پورے پونے پانچ بجے چوٹی کی جانب اٹھے گی.. اور میں نے ازراہ احتیاط ایک اہلکار سے دریافت کیا کہ فرض کیجئے ہم اس آخری کیبل کار پر سوار نہیں ہوتے تو کیا ہوگا تو اُس نے جو کُچھ کہا اُس کا مطلب یہی تھا کہ وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا.. آپ یہاں کی رات میں اترنے والی برف آلود ٹھنڈک میں ایک دو تین کمبل اوڑھ کر بھی ٹھٹھریں گے اور صُبح کا انتظار کریں گے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے پاس تو ایک کمبل بھی نہیں ہے.. اور یہ کہہ کر وہ مسخرہ اہلکار ہنس دیا تھا..

چنانچہ ہم چلتے نہ تھے، بڑھاپے کے باوجود سُبک رفتار ہوتے تھے اور ہر موڑ پر سوچتے تھے کہ لوٹ

چلیں لیکن اُس موڑ کے آگے بھی گُل بوٹوں، بھیگتی بیلوں اور سایہ دار بڑے بڑے پتّوں والے شجروں کا ایک ایسا جادوئی منظر دکھائی دیتا کہ ہم سوچتے، بس تھوڑی دور اور چلے چلتے ہیں پھر لوٹ چلیں گے.. دراصل ہم بارشوں میں بھیگتے جنگل کے فریب میں آ چکے تھے، ہم لوٹنا بھی چاہتے تو لوٹ نہ سکتے تھے.. ہم ایک متروک شدہ کوئلے کی کان کے قریب سے گذرے..

میمونہ بھی ڈری ہوئی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں حیرت اور اشتیاق کے بے خود چراغ روشن ہوتے تھے ''وہ دیکھو.. جنگل کے فرش پر سفیدے کا ایک پتہ پڑا ہے جو اتنا بڑا ہے کہ کسی دیوزاد سفیدے کا لگتا ہے.. اسے اٹھالیں..''

''نہیں، بے شک یہ ایک عجوبہ ہوگا لیکن نہیں.. یہ ہزاروں برسوں کے آبائی جنگل جُوں کے تُوں ہیں اور یہاں سے ایک پتہ بھی لے جانا ایک جُرم ہے.. جیسے آج سے تقریباً تیس برس پیشتر جب میں بولڈر رج عبور کر کے فیئری میڈو جا پہنچا تھا اور تب فیئری میڈو کا وہ جنگل جو نانگا پربت کے دامن میں تھا اسی طور آبائی حالت میں موجود تھا.. ہزاروں برسوں سے خزاں رسیدہ پتّے اور چیڑ کے بال گرنے سے فرش ایک گدّے کی صورت نرم تھا اور اُس میں سے جھرنے پھُوٹتے تھے.. مُرغ زریں اُن جھرنوں کے کناروں پر رقص کرتے اُن سے اپنی پیاس بجھاتے تھے.. ہزاروں برسوں سے بوسیدہ ہو کر گرنے والے درختوں کے تنے بھُربھُرے ہوتے تھے اور اُن میں عجیب رنگوں کی چیونٹیاں رینگتی تھیں اور اُس آبائی جنگل کے ہزاروں برس کے کنوارپن میں عجب شباہتوں اور بناوٹوں کی بے شمار تتلیاں اُڑا کرتی تھیں، میری ایک جرمن سائنس دان سے ملاقات ہوئی جو صرف فیئری میڈو کے اس قدیم جنگل میں پائی جانے والی رنگین تتلیوں کے بارے میں کوائف جمع کر رہا تھا..

اور پھر زمانے بدل گئے.. فیئری میڈو پر سیاحوں کی یلغار ہوگئی.. اور اُس میں کُچھ تو میرا دوش تھا کہ میں نے ''نانگا پربت بلتستان داستان'' تحریر کر کے پاکستانیوں کو اس پریوں کی چراگاہ کے وجود سے آگاہ کیا.. بے شک فیئری میڈو نے کبھی نہ کبھی تو دریافت ہو جانا تھا لیکن.. اگر میں وہ کتاب نہ لکھتا تو شائد فیئری میڈو کے جنگلوں میں اڑان کرنے والی تتلیاں کُچھ دیر اور زندہ رہ جاتیں، وہ آبائی جنگل سینکڑوں بے درد سیاحوں کے بُوٹوں تلے نہ روندا جاتا اور فیئری میڈو میں کیمپنگ سائٹس، جھونپڑے اور ہوٹل تعمیر کر کے اس کی کنوارگی کو داغدار نہ کیا جاتا.. میں ہمیشہ مُجرم محسوس کرتا رہا..

وہ جنگل فیئری میڈو کا ہم سنبھال نہ سکے اور یہ جنگل نیلے پہاڑوں کا ان لوگوں نے سنبھال لیا ہے، جُوں کا تُوں رکھا ہے.. ورنہ.. دنیا بھر میں کوئی ایسا قدیم جنگل ہے جس پر دنیا کی نویں بلند ترین، قاتل کہلاتی چوٹی کی برفیں یُوں اُمڈی آتی ہوں جیسے کسی بھی لمحے وہ مسمار ہو کر اُس جنگل سمیت آپ کو بھی ایک برفانی قبر میں

دفن کر دیں گی..نہیں ہے ناں...سوری نہ چاہتے ہوئے بھی میں موازنہ کرنے لگا ہوں!

دوسری جانب سے چند آسٹریلین نوجوان کاندھوں پر بھاری سامان اٹھائے، ٹرالیاں دھکیلتے ہانپتے ہوئے ہماری جانب آرہے تھے..

''ہم یہاں سے کچھ دور اپنے آبائی جنگل کی گھناوٹ کے اندر شکل میں شجر لگتے مجسمے تراش کر ایستادہ کر رہے ہیں اور دور سے کوئی نہیں پہچان پائے گا کہ یہ قدرتی درخت ہیں یا ہم نے تراشے ہوئے ہیں، ہم یہ کام بغیر کسی معاوضے کے کر رہے ہیں کہ یہ جنگل ہمارے ہیں...آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں، آخری کیبل کار کی روانگی میں صرف تین منٹ رہ گئے ہیں..''

اگر میں وہ ہوتا جو پی ایل او کو جوائن کرنے کی خاطر بیروت کی خانہ جنگی کو بھی خاطر میں نہ لاتا.. دریائے سین میں کود جاتا یا سنولیک کا سفر اختیار کر لیتا تو میں آج ہرگز نہ لوٹتا.. پر میں وہ نہ رہا تھا، مجھے لوٹنا تھا..

تمہاری حیات کے آسمان پر جتنے بھی ستارے باقی رہ گئے ہیں، وہ ٹمٹماتے ہیں، بجھنے والے لگتے ہیں لیکن آج ایک ایسا دن تھا کہ جتنے بھی ستارے اب تک باقی تھے وہ سب نیلاہٹ میں رنگے گئے تھے، دمکتے تھے تو لگتا تھا کہ نیلے رنگ کے چراغ ٹمٹمانے لگے ہیں..اور بارش سے بھیگتے جنگلوں کی نیم سیاہی میں ناآسودہ اور ناتمام حسرتوں کے پنچھی اداس اڑانیں کرتے ہیں..

ہم سڈنی کو لوٹتے تھے تو کچھ ٹمٹماتے ستارے حیات کی تاریک راہوں کو منور کرتے تھے اور ہماری کوسٹر کے ساتھ ساتھ عجب رنگوں کے پکھیرو پرواز کرتے ہمیں گھر چھوڑنے جاتے تھے..

ooooo

''سڈنی آپراہاؤس کی سفید تتلی..اور دیکھنا..''مانن'' نام کے بیلے رقص''

جیسے میرؔ نے کہا کہ دل سے شوقِ رُخ نکو نہ گیا..تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا.....تو میرے دل میں بھی ٹکٹیں جمع کرنے کا شوق تھا جواب تلک نہیں گیا.بچپن میں ڈاک کے ٹکٹ جمع کیا کرتا تھا،اپنا کُل جیب خرچ ملک ملک کی دیدہ زیب سٹیمپس کے لئے صرف کر دیتا تھا اور جب لڑکپن بیتا اور جوانی آئی تب بھی میں ٹکٹیں جمع کرتا رہا..ڈاک کی نہیں، دنیا بھر کے عجائب گھروں، آپراہاؤسز، تھیٹروں، قابل دید مقامات کی..اور بُل فائٹنگ کے میدان میں داخل ہونے والی وہ ٹکٹ..سان سباستیان یا میڈرڈ کے بُل رنگ میں داخل ہونے والا پروانہ ٹکٹ..اوران کے سوا درجنوں کہیں نہ کہیں داخل ہونے کی ٹکٹیں، میں جمع کرتا رہا..

میں نے ایک مستطیل شکل کا ایک اور ٹکٹ بھی محفوظ کرلیا ہے..

ایک زمانہ تھا جب ایک لوہے کے ٹرنک میں میرے سفروں کی یادگاریں، سوونیئر، پوسٹ کارڈ، تاریخی مقامات میں داخلے کے ٹکٹ، قرطبہ، دمشق، روم اور لنڈن سے پوسٹ کردہ اپنے ابّا جی کے نام خطوط محفوظ تھے..

گویا ان ٹکٹوں، پوسٹ کارڈوں اور خطوط کو محفوظ کر کے میں نے بیت چکے زمانوں کو بھی محفوظ کرلیا تھا..

استنبول سے پیرس جانے والی اورنیٹ ایکسپرس کا نچلے درجے کا ٹکٹ.. پراڈو میوزیم میڈرڈ، فان گوگ اور رائک میوزیم ایمسٹرڈیم، میٹرو پالٹن میوزیم نیو یارک، لوور پیرس میں داخلے کے ٹکٹ.. ''فیئٹم آف آپرا'' کھیل، بارسلونا کے پکاسو میوزیم میں داخل ہونے کا پروانہ..مسجد قرطبہ میں داخلے کا ٹکٹ جس پر''مزکیتا کیتھڈرل''یعنی''مسجد کلیسا''درج تھا..

قصرالحمرا کا وہ ٹکٹ جس پر شیروں کے صحن کی تصویر ثبت تھی..

فلورنس میں مائیکل انجلو کا مجسمہ اکیڈمی میں ایستادہ..''داؤد'' دیکھنے کے لیے بے شمار لیروں کا خرچہ..

قرطبہ سے اشبیلیہ جانے والی بس کا ٹکٹ..

استنبول سے تہران جانے والی بس کا ٹکٹ جو باسفورس کا آہنی جنگل توڑ کر مجھے سمندر میں دفن کرنے لگی تھی..اور ایسے درجنوں اجازت نامے اور ٹکٹ جو اُس آہنی صندوق میں محفوظ تھے..

اور جب میں بتیس برس پیشتر اپنے محبوب لکشمی مینشن سے اپنی موجودہ رہائش گاہ 22- جے گلبرگ III میں منتقل ہوا تو اس منتقلی کی افراتفری میں وہ ٹین کا صندوق کہیں گم ہو گیا..میری جہاں گردیوں کی شہادتوں کا وہ صندوق گُم ہو گیا..

اور اچھا ہوا کہ وہ گُم ہو گیا ورنہ میں ہر ٹکٹ، تصویری پوسٹ کارڈ، خط یا سووینئر دیکھ دیکھ کر بیت چکے زمانوں کا ماتم کرتا رہتا..

پھر اتنے برسوں بعد اپنی عُمر کے 75 ویں برس میں میرے ہاتھوں میں ایک اور یادگار ٹکٹ ایسا آتا ہے جسے میں سنبھال لیتا ہوں..اور اس ٹکٹ پر درج ہے

''جَون سدرلینڈ تھیٹر۔سڈنی آپرا ہاؤس، آسٹریلین بیلے رقص'' مانن، جمعہ 11-اپریل 2014ء، ساڑھے سات بجے شام، نشست P-29، دروازہ نمبر 104,30 ڈالر''

یہ سڈنی آپرا ہاؤس کی سٹیج پر کھیلے جانے والے بیلے رقص کا کھیل ''مانن'' کا ٹکٹ ہے..

بے شک بنیادی طور پر تھیٹر ایک تربیت گاہ ہے اور فلم اُس تربیت کا تخلیقی اظہار لیکن میں ہمیشہ سے فلم کے فیتے کا ہی اسیر رہا، تھیٹر کی جانب کم ہی راغب ہوا لیکن اس کے باوجود میں ہزاروں فلموں کو بُھول چکا پر وہ تمام تھیٹر پرفارمنس جو میں نے آج تک دیکھی ہیں وہ ذہن سے فراموش نہیں ہوتیں یہاں تک کہ پچپن برس پیشتر نوخیزی کے دنوں میں ماسکو کے مشہور زمانہ بالشوئی تھیٹر میں ''سوان لیک'' کا جو بیلے رقص کھیل دیکھا تھا اُس کا ہر منظر میری یادداشت میں نقش ہے..شائد اس لیے بھی کہ دنیا کی سب سے بڑی بیلے رقاصہ گالینا اولانووا نے اس میں مرکزی کردار ادا کیا تھا..اولانووا کے بدن کی تتلیوں کی مانند سبک خرامی جیسے وہ ہوا میں پرواز کرتی ہو اور پھر یوں محسوس ہوتا تھا کہ فضا میں ایک لمحے کے لئے ساکت ہو کر پھر سے زندہ ہو گئی ہے..پچھلے برسوں دوبارہ ماسکو گیا تو معلوم ہوا کہ گالینا اولانووا کی یاد میں ایک میوزیم قائم کیا گیا ہے جہاں اُس کے رقص کے شوز محفوظ کر لئے گئے

ہیں۔لنڈن کے ویسٹ اینڈ میں ''ورلڈ آف سوزی وانگ'' ساؤتھ اینڈ کے ایک دیہاتی سے تھیٹر میں ''میکبتھ'' اور پھر ابھی کچھ عرصہ پہلے نیویارک کے براڈوے پر برسوں سے دکھایا جانے والا آپرا ''فینٹم آف دے آپرا'' اور ''ویسٹ سائڈ سٹوری''۔اور ہاں ماسکو میں رُوسی زبان میں ''بردز رکارا موزوف''۔ چنانچہ کتابیں اور فلمیں بھول جاتی ہیں لیکن آپ نے جتنے تھیٹر دیکھے ہوتے ہیں وہ یادداشت میں محفوظ ہو جاتے ہیں، گُم نہیں ہوتے۔۔ پاکستان سے روانہ ہوتے ہوئے سُمیر نے ایک آرکی ٹیکٹ ہونے کے حوالے سے مجھ سے درخواست کی تھی کہ ابا سڈنی آپراہاؤس کی صرف تصویریں اتار کر واپس نہ آ جانا، اُس کے اندر کسی نہ کسی پرفارمنس دیکھنے کا تجربہ ضرور حاصل کرنا کہ عہد جدید کے سب سے شاندار اور دل کش آپراہاؤس کے اندر اگر انسان کوئی کھیل دیکھے، کسی رقص کا مشاہدہ کرے تو وہ کیسا محسوس کرتا ہے۔۔داخلے کا ٹکٹ میرے ذمّے۔۔جتنا بھی ہو۔۔

میں نے اپنے کسی سفرنامے میں شائد یہ ''سنہری اُلّو کا شہر'' تھا اپنی ایک کمینی خصلت کا تذکرہ کیا تھا کہ جن عمارتوں کا کُل عالم میں بہت شہرہ ہو، اور جن خواتین کے حُسن کے بہت چرچے ہوں میں اُن سے بُغض رکھنے لگتا ہوں، پہلے سے فیصلہ کر لیتا ہوں کہ تاج محل بے شک جتنا بھی پُرجلال اور پُرجمال اور پُرملال ہو۔۔ میں نے متاثر نہیں ہونا، پسند نہیں کرنا۔۔اور کوئی عورت۔۔مارلن منرو ہو مدھو بالا یا کوئی غزال شب۔۔بے شک حُسن میں غدر ہو میں نے اقرار نہیں کرنا۔۔

اسی طور۔۔میں نے سڈنی آپراہاؤس کے بُغض کی بھی ایک گٹھڑی باندھ رکھی تھی۔۔آسٹریلیا کا امتیازی نشان سڈنی آپراہاؤس۔۔نئے سال پر اگر آتش بازی کے مظاہرے ہوتے ہیں تو آپراہاؤس اور سڈنی برج۔۔ ڈاک کے ٹکٹوں پر، سیاحتی کتابچوں میں، حرام ہے آسٹریلیا کی کسی اور عمارت کی تصویر ہو۔۔وہ ایک کہاوت ہے ناں کہ جانے کیسے خواجہ سراؤں کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہو گیا اور اُنہوں نے مارے خوشی کے اتنا چُوما کہ مار دیا۔۔

سڈنی آپراہاؤس بھی آسٹریلیا والوں کا ایسا ہی غیر متوقع بیٹا تھا جسے وہ مسلسل چُومتے رہتے تھے۔۔

چنانچہ ہم ایک دوپہر اس بیٹے کو دیکھنے کے لئے چلے ہی گئے۔۔

جیسے تاج محل کا سینہ برف انبار ایک محراب کو بھرتا میرے وجود پر آ گرا تھا۔۔میرے سب کینے اور بُغض اور ناپسندیدگی کے ارادے تحلیل ہو گئے تھے اور میں ابد کے رخسار پر اترنے والے اُس آنسو کو اپنی آنکھوں میں اُتارتا، اُسے ایک مندر بناتا، گھڑیال بجاتا، سنکھ پھونکتا اُس کی عظمت کا پجاری ہوا جاتا تھا۔۔

تو یہاں بھی مجھ پر یہی آفت نازل ہو گئی۔۔جیسے سراج اورنگ آبادی کا خیال تھا کہ کتاب عشق طاق میں دھری کی دھری رہ گئی۔۔تو میرے سب اجتناب اور انکار دھرے کے دھرے رہ گئے۔۔

سڈنی آپراہاؤس کی پہلی جھلک دیکھی تو آنکھیں دھری کی دھری رہ گئیں، کُھلی کی کُھلی رہ گئیں.. ایک سفید بادبانوں والی کشتی تھی جو سمندروں میں حنوط تھی، ایک پر سمیٹے ہوئے سفید تتلی تھی جو پانیوں پر براجمان ہوگئی تھی..

آپراہاؤس کے آس پاس جو سمندر تھے اُن میں جو بادبانی کشتیاں تیرتی تھیں، وہ اس عمارت کے روبرو ہوتیں تو تیرنا بُھول جاتیں، اُن کے سامنے ایک اور سفید بادبانوں والی کشتی تھی، اگرچہ وہ تیرتی نہ تھی، پانیوں کی نیلاہٹ میں ٹھہری ہوئی تھی.. میں اور میمونہ دو حیرت زدہ اور خوش، میلے میں آئے ہوئے بچوں کی مانند جُلبلے ہوتے سیڑھیاں طے کر کے آپراہاؤس کے بادبانوں کے سائے تلے چلے گئے..

وہاں بہت رونقیں تھیں.. ملک ملک کے، بھانت بھانت کے سیّاح آرکی ٹیکچر کے اس شاہکار کو اپنی آنکھوں سے کم دیکھتے تھے، کیمروں کی آنکھ سے زیادہ دیکھتے تھے..

یہ کیمرہ، سیل فون ایسی دو لعنتیں تھیں جنہوں نے انسان کو ایک روبوٹ کر دیا تھا.. دنیا بھر میں کہیں بھی چلے جائیے لوگ منظر یا عمارت کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے، کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں. لمحہ موجود میں جو حیرتیں اُن کے سامنے ہوتی ہیں وہ اُن کو کیمرے کی قید میں محفوظ کرتے ہیں اور وطن واپسی پر اُن حیرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں.. نیپال جاتے ہوئے پی آئی اے کے کسی اہلکار نے میرے سامان سے میرا اشائی پینکس کیمرہ شائد اپنی والدہ محترمہ کے نکاح کی تصویریں اُتارنے کے لئے غتر بود کر لیا.. ازاں بعد جب میں ایک اور ٹریک پر گیا اور کیمرے کے بغیر گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں بھی آج تک تمام مناظر، بلندیوں، برفوں، گلیشیئرز وغیرہ کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھتا رہا تھا اور اب پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں تو یہ تو دنیا ہی الگ ہے، منظر ہی جُدا اور انوکھے ہیں.. چنانچہ دنیا کو کیمرے کی آنکھ سے نہیں، اپنی آنکھ سے دیکھو..

اور میری آنکھوں میں آپراہاؤس کے سفید بادبان نقش ہوتے تھے.. یہ بادبان اتنے بظاہر نازک اور ملوک کہ ذرا سی ہوا کے چلتے ہی حرکت میں آجائیں گے.. کُھل گئے شہرِ غم کے دروازے، اِک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی.. تو کیا اہلِ سڈنی یکدم بے یقین نہ ہو جائیں گے اگر سڈنی آپراہاؤس کی بادبانی کشتی اِک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی سمندروں میں تیرنے لگے.. اور کیا پتہ کن ساحلوں پر جا لنگر انداز ہو اور سڈنی کی بندرگاہ بیوہ ہو جائے..

یہاں آپراہاؤس کے سفید بادبانوں تلے اور ہاں قریب ہو کر دیکھتے تو ان بادبانوں پر مچھلی کے چانوں کی مانند نشاں ہیں، یہاں ایک پاکستانی خاندان مجھے پہچان کر حیرت میں حواس کھو بیٹھا کہ تارڑ صاحب.. آپ یہاں.. دیارِ غیر میں کوئی بھی شناسا چہرہ دکھائی دے جائے بے شک وہ ایک فضول سا تھیٹر اداکار ہو، معمولی

سا گلوکار ہو یا کنویں میں سے پانی نکالنے والے ''بوکے'' کی شکل کا مزاحیہ کالم نگار ہو..وہ آپ کے وطن کی نشانی ہوتا ہے اور آپ اُس پر اپنی محبت نچھاور کر دیتے ہیں..

ہم ایک قدیم پارک میں گئے جس کے پار آپرا ہاؤس کا سب سے دل کش نظارہ تھا..میں نے وہاں ایک بوڑھے برگد کی داڑھیوں میں پوشیدہ ایک ایسے جاپانی کو دیکھا جو آلتی پالتی مارے ایک بُدھ کی مانند آپرا ہاؤس پر آنکھیں جمائے بیٹھا تھا..ایک موٹی گلہری اُس کے برابر میں فراموش کردہ سینڈوچ سے لطف اندوز ہو رہی تھی..

آپرا ہاؤس کی ٹکٹوں کا بندوبست سلمان عالی شان نے کیا..

جہاں سے مناسب دکھائی دیتا تھا آپرا ہاؤس کے اُس حصّے کی ٹکٹیں تقریباً تین سو ڈالر مالیت کی تھیں تو میں نے سلمان سے کہا ''یہ تو ہزار ڈالر کا نسخہ ہوا جاتا ہے..بھئی ہم نے تو صرف ٹوٹل پورا کرنا ہے کہ ہم نے سڈنی آپرا ہاؤس میں ایک کھیل دیکھا تھا، بے شک وہ ہم ہال کی آخری نشستوں پر براجمان ہو کر دیکھیں، چنانچہ ایک سو چار ڈالر فی نشست پر سودا ہو گیا..

میں نے مُونا کی مدد سے آپرا ہاؤس کی ویب سائٹ سے رابطہ کر کے دریافت کیا کہ حضور یہ فرمائیے کہ شمولیت کے لیے ڈریس کوڈ کیا ہے کہ ہمارے پاس سیاہ ٹکسیڈو سُوٹ اور بوٹا ئز تو نہیں ہیں تو کیا پہن کر آئیں؟

''سَر..آپ آسٹریلیا میں ہیں، آپ کسی بھی لباس میں آپرا دیکھنے کے لئے آسکتے ہیں، البتہ نیکر سے گریز کریں تو مناسب ہو گا۔''

ویسے میں نے مقدور بھر ٹش نکالی، خوش لباس ہوا، نیلی جین، نیلے جوگرز کے ساتھ میچ کرتا نیلا بنانا ریپبلک کا بلیزر زیب تن کیا اور جب وہاں پہنچا تو بہت شرمندہ ہوا کہ وہاں تو ہر شخص بنا ٹھنا تھا، ہر خاتون اپنی زندگی کے بہترین لباس میں تھی..مغرب میں آپرا یا تھیٹر کی شام اُن کی ثقافتی اور ذوق جمال کی پرکھ کا ایک مظہر ہوتی ہے، شائد میں آپرا دیکھنے والوں میں سے سب سے بُرے لباس میں تھا اگرچہ میمونہ ایک زردسندھی لباس میں بہت سے لوگوں کی آنکھوں کا تارہ ہو رہی تھی..

بیلے رقص ''مانن'' نام کا..

کوریوگرافی سَر کینتھ میکملن کی تھی..

موسیقی جُولز مسانٹ کے زیرنگرانی ایک آرکسٹرا کو ترتیب دیتے ہوئے..

لباس اور سیٹ ڈیزائن پیٹر فارمر کے کمال تھے..

ہمارے سامنے تو نہیں، ذرا گہرائی میں ''منین'' نام کا جو بیلے کھیل ہماری نظروں میں آ رہا تھا تو اگر

اُس کی پوری کہانی بیان کروں تو اُس میں بوریت اور بیزاریت کا شدید خدشہ ہے تو کُچھ جھلکیاں جن سے اس کھیل کے کُچھ زیرو بم نظر نواز ہو سکیں!

پہلا منظر!

پیرس کے قریب قدیم زمانوں میں ایک سرائے کا صحن.. جہاں تھیٹر کی اداکارائیں، اُن کے عاشق شرفاء، طالب علم اور معاشرے کے متمول افراد، ایک صاحب گریکس کی ہمشیرہ صاحبہ سے ملنے کے لئے چلے آتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو ایک راہب خانے کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ ہمیشہ ''مانن'' ہے اور پھر حالات بدلتے ہیں، ایسے زمانے آتے ہیں کہ وہی خاتون ''مانن'' جو ایک راہبہ ہونے جاتی تھی اُس پر ایک بدن فروش طوائف ہونے کی تہمت لگتی ہے، اُسے گرفتار کر کے امریکہ بدر کر دیا جاتا ہے جہاں بالآخر وہ اپنے بھائی کے ہاتھوں میں لوسیانا کے جنگلوں میں بے ہوش کر مر جاتی ہے..

''مانن'' مر گئی اور سڈنی آپرا ہاؤس کا پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا..

یہ موت ہے جو ہر شے کو معنویت دیتی ہے..

اگر ''مانن'' زندہ رہ جاتی تو شائد آپرا ہاؤس میں موجود تماشائی بے حد مایوس ہوتے کہ یہ مر کیوں نہیں گئی..

اگر ایک ادبی فیسٹیول میں مُجھ سے پوچھا گیا کہ آپ کے سفرناموں اور ناولوں میں پانی، پرندے اور موت، بہت ہیں تو اس کا کیا جواز ہے تو میں نے یہی عرض کیا تھا کہ یونانی المیہ نگاروں سے بھی تب یہی سوال پُوچھا گیا ہوگا، یوریپڈیز، ایسکلس اور سوفوکلیز سے بھی یہی پُوچھا گیا ہوگا کہ آخر آپ کے ہر کھیل کا انجام موت ہی کیوں ہوتا ہے، تو اُن میں سے کسی ایک نے کہا ہوگا ''موت ہی واحد سچ ہے۔''

مانن کو بہر طور مرنا تھا اور وہ مر گئی..

پھر ہم لوٹ گئے.. اُس مسکن کی جانب لوٹ گئے جو ریحان کا گھر تھا..

نہ تو خوابوں پر کُچھ اختیار ہوتا ہے اور نہ پرندوں کے کُوکنے پر..

نہ خواب آپ کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں اور نہ ہی پرندے آپ کی خواہش کے مطابق گیت گاتے ہیں..

خواب ماضی کے مزاروں پر دیئے جلاتے ہیں

اور پرندے اُن دیوں کو بجھاتے چلے جاتے ہیں..

○○○○○

''ایک لاکھ ساٹھ ہزار مجرموں کا براعظم..جنہوں نے ''وحشیوں کو ملیامیٹ کر دیا''

میں عرض کر چکا ہوں کہ آسٹریلیا کے خیال نے مجھے کبھی ہیجان سے آشنا نہ کیا، میرے اندر جہاں گردی کے جتنے جرثومے کلبلاتے پھرتے تھے اُن میں سے کمبخت کوئی ایک ناتواں سا جرثومہ بھی نہ تھا جس نے سر اٹھا کر مطالبہ کیا ہو کہ چلو چلو آسٹریلیا چلو..اور شنید تھی کہ وہاں آباد گورا لوگ سب کے سب سزا یافتہ مجرموں، قاتلوں، ڈاکوؤں اور بچے اغوا کرنے والوں کی آل اولاد ہیں اور شین وارن کو دھیان میں لائیے تو یہ ایک حقیقت لگتی ہے..پھر بھی یقین نہ آتا تھا، آخر ڈان بریڈمین یا نکول کڈمین کے آباؤ اجداد تو قاتل لٹیرے نہیں ہو سکتے اور جب میں نے سرسری تحقیق کی تو کھلا کہ..ہو سکتے ہیں..

کہا جاتا ہے کہ 1600ء میں یہ ہالینڈ کے جہازران تھے جو سمندروں میں بھٹکتے، رزق تلاش کرتے، اُن کی اپنی زمین تنگ تھی تو زمین کی وسعتیں تلاش کرتے آسٹریلیا جا پہنچے..یہ ڈچ مُہم جُو تھے جنہوں نے آسٹریلیا کا براعظم دریافت کیا تھا اور اُنہوں نے اسے ''نیو ہالینڈ'' کا نام دیا..

ویسے ان ڈچ حضرات کی قسمت بڑی کھوٹی ہے..ان کے جیالے جہاز رانوں نے بہت سی نئی سرزمینیں دریافت کیں لیکن یہ نصیب میں کسی اور کے آئیں..وہ جان جوکھوں میں ڈال کر شکار تو مار لیتے تھے لیکن فوراً ہی دیگر گِدھ اُس پر اتر آتے تھے اور اُنہیں بھگا کر اُس کے تازہ خُون سے اپنے آپ کو سیراب کر لیتے تھے..ہالینڈ والے ایک نئی سرزمین امریکہ دریافت کر لیتے ہیں اور مین ہیٹن نام کے جزیرے کو مقامی لوگوں سے چند موتیوں اور فضول سے پتھروں کی ادائیگی کر کے ''خرید'' لیتے ہیں اور اُسے ''نیو ایمسٹرڈیم'' کا نام دے کر ایک شہر آباد کرتے ہیں..اور پھر انگریز حضرات جیسے سکھ نعرہ لگاتے ہیں کہ راج کرے گا خالصہ،

وہ ''راج کرے گا برطانیہ'' کے پھریرے لہراتے پہنچ جاتے ہیں اور ڈچ حضرات کو بے دخل کر کے ''نیو ایمسٹرڈیم'' کو ''نیویارک'' کا نام دے کر اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیتے ہیں..ڈچ ہندوستان میں وارد ہو کر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھتے ہیں تو یہاں بھی انگریز آ دھمکتے ہیں..اور اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر لیتے ہیں جو 1857ء تک کمپنی بہادر کہلاتی ہے اور پھر آسٹریلیا..ڈچ اُسے ''نیو ہالینڈ'' پکارتے ہیں تو انگریز صاحب بہادر کیپٹن جیمز کُک نام کے آج کے سڈنی کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو کر اسی مقام کو ''نیو ساؤتھ ویلز'' کا نام الاٹ کر دیتے ہیں..بے چارے ڈچ!

اب صورت حال کُچھ یُوں تھی کہ لنڈن کی گلیاں چھوڑ کر کون سات نہیں بلکہ ہزاروں سمندر پار آسٹریلیا جیسے ویرانے میں جا بسیرا کرے، اگر بہتر زندگی اور آسائشوں اور کاروبار کے پھیلاؤ کے امکانات دریافت کرنے ہیں تو راستے میں ہندوستان کی سونے کی چڑیا میں بسیرا کر کے اُس کے پَر کیوں نہ نوچے جائیں چنانچہ آسٹریلیا اپنی قدامت میں محفوظ پڑا رہا..پھر انگلستان میں جتنے بھی قید خانے تھے، وہ مُجرموں سے لبریز ہو گئے چنانچہ ان کے لئے آسٹریلیا کو ایک ''کالا پانی'' قرار دے کر مُجرم حضرات کے جہاز بھر بھر کر..آغاز میں پورے گیارہ بحری جہاز ان مُجرموں سے بھرے آسٹریلیا روانہ کر دیئے گئے..اور وہاں اُن کی قید کے دن پُورے ہونے پر اُنہیں کُھلا چھوڑ دیا گیا کہ تم انگلستان واپس نہیں جا سکتے، یہیں اس ویران براعظم میں گُم ہو جاؤ..اور اب قانونی طور پر تمہیں اجازت ہے کہ زرخیز زمینوں پر قبضہ کر لو اور اگر مقامی لوگ مدافعت کرتے ہیں تو اُنہیں بے دریغ قتل کر دو..اور خوش حال ہو جاؤ..چنانچہ اگر آج آسٹریلیا کے صحراؤں کی مٹی سُرخ رنگ کی ہے تو اس میں مقامی لاکھوں ''وحشیوں'' کے خون کی آمیزش بھی ہے..

ابتدائی ایام میں پورے ایک لاکھ ساٹھ ہزار سنگین نوعیت کے مجرم آسٹریلیا کے ساحلوں پر اتارے گئے..اور جونہی وہ آزاد ہو کر مقامی ''وحشیوں'' کو ملیامیٹ کر کے اُن کی آبائی زمینوں پر قابض ہو کر ''خوش حال'' ہوئے تو اُن کے جو آل اولاد تھی، وہ اپنے گھناؤنے ماضی سے اتنی خوفزدہ تھی کہ وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے کہ ہم قاتلوں اور لٹیروں کی اولاد ہیں..اور پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ اُنہی مُجرم آباؤ اجداد پر فخر کرنے لگے اور میں اُن کے اس جواز سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہاں وہ مُجرم اور معاشرے کے رذیل تھے لیکن یہ اُن کی جدوجہد اور ذلت کی زندگی ہے جس کی وجہ سے ہم آج ایک عظیم براعظم کی قسمت کے مالک ہیں..تو ہم اُن پر فخر کرتے ہیں..

اس رُجحان سے ایک نہایت صحت مند رویئے نے جنم لیا..انگریز معاشرے میں خاندانی پس منظر، بے شک لوٹ کھسوٹ سے جمع کی گئی دولت، عالی شان محل اور قلعے کسی انسان کی سماجی حیثیت کا تعین کرتے

تھے لیکن یہاں آسٹریلیا میں نہ خاندانی پس منظر تھا اور نہ ہی آباؤ اجداد کی عظمت کا تکبّر..صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ اس شخص نے اگر اپنی ذاتی کاوش اور لیاقت سے معاشرے میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے تو قابل عزت اور احترام کے لائق یہی ہے..

مجھے یہاں آسٹریلوی معاشرے کی فراخ دلی اور بالغ نظری کا اقرار کرنا ہے کہ میں جہاں کہیں بھی گیا..جتنے بھی غیر یورپی افراد سے ملاقات ہوئی، کیا پاکستانی، ہندوستانی، لبنانی، عراقی، چینی یا بنگالی سب نے بلاتخصیص آسٹریلیا کے لوگوں کے حُسن اخلاق اور برتاؤ کی توصیف کی..کسی ایک نے بھی شکائت نہ کی..سب نے بے دریغ کہا، یہ لوگ مددگار ہیں، تعصّب نہیں رکھتے، ہمیں حقیر نہیں جانتے، اتنے دوست اور تعاون کرنے والے کہ بعض اوقات لگتا ہے کہ ہم ان کے ملک میں نہیں آ بسے یہ ہمارے ملک میں آ کر آباد ہو گئے ہیں..

میرا قیاس ہے کہ یہ فراخ دلی اور تعصّب سے پاک ردّ یہ صرف اس لئے ہے کہ ان کے آباؤ اجداد مجرم تھے..وہ کسی کو بھی حقیر نہیں جانتے..

بے شک اُن کے ماضی کی سفید چادر پر خون کے دھبّے ہیں، ظُلم کے نشان ہیں پر وہ آج کھلے دل سے سرکاری طور پر اپنے جرائم قبول کرتے جن پر ظلم ڈھائے گئے اُن سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں..

اور ان میں سے ایک ظلم ''چوری کی گئی نسلیں'' کا ہے..جس کا تذکرہ کر چکا ہوں..

ایک زمانہ ایسا تھا کہ نسلی امتیاز کے مارے ہوئے گورے لوگوں نے سرکاری طور پر اجازت دی بلکہ سرپرستی کی کہ یہ جو ابورجنل وحشی ہماری آمد سے پیشتر ہزاروں برسوں سے ایک غیر تہذیب یافتہ زندگی گذارتے تھے اُن کے بچّوں کو تہذیب یافتہ کرنے اور عیسیٰ کی بھیڑیں بنانے کے لئے اغوا کر کے، چھین کر لے آؤ..چنانچہ ابورجنل لوگوں کے بچّے، اُن کی ماؤں کی گود سے، صحراؤں میں اپنے باپ کے ہمراہ شکار کرتے، کنگروؤں کا پیچھا کرتے، اپنی آزاد دنیا میں آزاد پھرتے تہذیب کے نام پر اغوا کر لئے گئے، اُن میں سے کُچھ کو مشنری سکولوں میں داخل کروایا گیا، بیشتر گوروں کی رہائش گاہوں میں غلام کے طور پر مشقت کرنے لگے، بہت سے اپنے ماں باپ سے جدائی کو برداشت نہ کر سکے، روتے روتے مر گئے..اور اُن کے ماں باپ اپنے جگر گوشوں کے بچھڑنے کے غم میں صحراؤں میں بلکتے پھرے..

اور تہذیب کا قانون یہ بھی تھا کہ اغوا شدہ بچّے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جان سکے کہ اُس کے ماں باپ کون تھے اور وہ کہاں ہیں اور نہ ہی ماں باپ انصاف کے کسی در پر دستک دے کر پُوچھ سکتے ہیں کہ ہمارا بچّہ اگر ہے تو کہاں ہے..

''چوری کی گئی نسلیں'' آسٹریلوی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے..

اور آج نہ صرف آسٹریلوی وزیراعظم بلکہ عوام اس ظلم اور بربریت پر شرمندہ معافی کے خواستگار ہوتے ہیں..

ویسے استعماری اور دنیا پر قابض ہو جانے والی قوموں نے تاریخ میں کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں تو کیا کبھی اُن کے کسی وزیراعظم نے ان مظالم کے بارے میں شرمندگی کا اظہار کیا ہے..مظلوموں سے معافی مانگی ہے..

تفصیل میں کیا جانا..کیا آج تک کسی امریکی صدر نے ریڈ انڈین لوگوں کے قتل عام اور اُن کی نسل کو ملیا میٹ کر دینے کے بارے میں شرمندگی کا اظہار کیا ہے..

تو اس تناظر میں آسٹریلوی وزیراعظم کا ''چوری کی گئی نسلیں'' کے حوالے سے معافی نامہ اُس قوم کی بڑائی کا ثبوت ہے..کہ اگر آپ کے آباؤ اجداد مُجرم رہے ہوں کبھی آپ کو جُرم کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے..

وہ جو وارث تھے اس سرزمین کے، وہ جو مالک تھے ہزاروں برسوں سے اس براعظم کے، جو اس کے جانوروں، جھاڑیوں، بُوٹوں اور شجروں کے ساتھ ہی اس زمین پر نمودار ہوئے تھے اُن کی نسل مٹاتے ہوئے اُن کی زمینوں پر قبضہ کرتے ہوئے، اُن کے بچّوں کو اغوا کرتے ہوئے وہ جو باہر کے لوگ تھے تب اُن کو کُچھ ندامت نہ ہوئی تھی اور اب جا کر اُنہیں احساس ہوا تھا کہ اُنہوں نے کیسے کیسے ستم ڈھائے..اب اتنے شرمندہ ہوئے کہ سِڈنی کی پارلیمنٹ میں، جہاں نیو ساؤتھ ویلز کے نمائندے بیٹھتے ہیں، وزیراعظم اور سپیکر کی نشستوں کے پہلو میں قومی پرچم کے علاوہ ابورجنل قوم کا آبائی جھنڈا بھی آویزاں کر دیا گیا ہے..

○○○○○

''سڈنی پارلیمنٹ اور شوکت مُسلمین کا ہمارے اعزاز میں ناشتہ''

سڈنی پارلیمنٹ کے واحد مسلمان ممبر لبنانی نژاد شوکت مُسلمین نے ہمیں خصوصی طور پر پارلیمنٹ میں ناشتے کے لیے مدعو کیا تھا..

شوکت بے حد وجیہہ خوش مزاج اور خوش گفتار نہائت ہی ڈاؤن ٹُو ارتھ قسم کے شخص تھے، کئی برسوں سے سڈنی پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوتے چلے آتے تھے لیکن براہ کرم اُن کا موازنہ اپنے بیشتر بدتمیز، نیم خواندہ اور اوچھے ایم پی اے حضرات سے نہ کیجئے گا، جن کی لینڈ کروزر کو اگر کوئی پولیس اہلکار روک لے تو وہ نہ صرف اُسے بر سرِ عام زدوکوب کرتے ہیں بلکہ اسمبلی میں اپنا استحقاق مجروح ہونے کا واویلا کر کے اُس غریب کو معطل کروا دیتے ہیں، دراصل بہت سے دیہی اور شہری علاقوں میں الیکشن صرف دھونس دھاندلی اور کلاشنکوف کے زور پر جیتا جاتا ہے تو اُن کی خصلت میں قانون شکنی اور غنڈہ گردی مستحکم ہو چکی ہوتی ہے، اور وہ جو اقتدار میں آ کر اپنی کاروباری سلطنتوں کو مزید توسیع دینا چاہتے ہیں اُنہیں کچھ غرض نہیں ہوتی کہ اُن کے نمائندے کیسے الیکشن جیتتے ہیں، وہ اُن کی غنڈہ گردی کو درگذر کرتے ہیں، بھلے یہ پیپلز پارٹی ہو، نُون لیگ یا ایم کیو ایم ہو..

شوکت مُسلمین ایک پڑھے لکھے، باشعور اور سُلجھے ہوئے ایم پی اے تھے..دراصل یہ بھی جاوید نظر کے انتظام تھے، اُنہوں نے میری آمد پر شوکت صاحب سے رابطہ کیا اور اُنہیں میرے بارے میں بتایا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ہمارے ساتھ کسی سویر ناشتہ کریں..اور وہ چلے آئے..گورے چٹے لبنانی، ایک خصوصی عرب کے شکل کے ذرا مضبوط دکھائی دیتے، ظاہر ہے ہمارے پاکستان کے موجودہ حالات کے بارے میں فکرمند تھے، دیر تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی اور اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ ابھی کچھ روز پیشتر اُنہوں نے ایک خاتون آسٹریلوی وزیر کے ہمراہ پاکستان کا دورہ کیا تھا اور وہ معذوروں کے اداروں کے لئے کئی درجن وہیل چیئرز تحفے کے طور پر لے گئے تھے..وہیل چیئرز کے حوالے نے میمونہ کو چوکنا کر دیا کہ وہ بھی ایک عرصے [illegible] کے لئے رضاکارانہ طور پر کام کر رہی ہے..بلکہ میں اکثر اُسے کہتا تھا کہ باہر

کے معذوروں کے لئے اتنی فکرمند ہوتی ہو اور گھر میں جو معذور خاوند ہے اُس کی کُچھ پرواہ نہیں کرتی..

یہ چین کا سنکیانگ ہو یا آسٹریلیا، یہ جمیل عباسی کی عطیہ کردہ خوبصورت اجرکیں ہوتی ہیں جنہیں میں چنیدہ لوگوں کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرتا ہوں..شوکت کے کاندھوں پر جب میں نے اجرک کی چادر ڈالی تو وہ بے حد جذباتی ہو گئے، اُسے چُوم کر پاکستان سے اپنی اُلفت کا اظہار کیا..اُنہوں نے نہائت انکساری سے درخواست کی کہ ہم کسی روز پارلیمنٹ میں اُن کے مہمان بنیں اور ہم ایک اور ناشتہ اکٹھے کریں..

سڈنی پارلیمنٹ بظاہر ایک سادہ سی قدیم عمارت تھی، پارلیمنٹ کی بجائے ہسپتال لگتی تھی اور میرا گمان درست ہوا کہ اس کا ایک حصّہ کسی زمانے میں ہسپتال ہوا کرتا تھا اور تب بے ہوشی کی دوا ایجاد نہ ہوئی تھی چنانچہ مریضوں کے آپریشن کئے جاتے تو اُن کی چیخ و پکار سے بام و در لرز اٹھتے..لیکن اسی سادہ سی عمارت کا اندرون شاہانہ اور شاندار تھا..اس کی راہ داریوں میں جُھکے جُھکے باوردی گورے اہلکار لگتا تھا کہ ڈکنز کے کسی ناول کے کردار ہوں..ایک مخصوص مہک تھی قدامت کی..جو اس کے چیمبرز، غلام گردشوں، خصوصی کمروں، قالینوں، آرائشوں اور دیواروں پر آویزاں تصویروں میں سے جنم لیتی تھی..

ہم نے نہائت فخر سے وزیراعظم کی کُرسی پر براجمان ہو کر تصویریں اتروائیں..اگرچہ اُس کُرسی پر بیٹھتے ہوئے ہم نے ہاتھ لگا کر اُس کی موجودگی کا تعین کیا اور پھر بیٹھے کہ عوام الناس اور رائلٹی میں یہی فرق ہوتا ہے..

نپولین نے جب اپنی حیرت انگیز جنگی حکمت عملی سے پورے یورپ کو زیر کر لیا تو اُس نے شدید اقرباء پروری کا مظاہرہ کیا اور جتنے بھی قریبی عزیز، بہن بھائی وغیرہ تھے اُنہیں مختلف ملکوں کے بادشاہ اور ملکائیں وغیرہ اپائنٹ کر دیا..ایک بے وقوف سی ہمشیرہ کو کُچھ نہ ملا تو اُس نے بہت فریاد کی کہ بھائی جان ہمیں بھی تو ملکہ بنا دو..نپولین نے یورپ کے نقشے پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ ہالینڈ ابھی تک بیکار پڑا ہے تو اُس نے اس بے وقوف ہمشیرہ کو ہالینڈ الاٹ کر دیا..ہمشیرہ ملکہ بن کر ایک آپراہاؤس گئیں تو ڈچ شاہی خاندانوں کے مفتوح افراد بھی وہاں موجود تھے..ہمشیرہ کی آمد پر سب تعظیم کے لیے نئی ملکہ کے لیے کھڑے ہو گئے..اور ہمشیرہ اپنی کُرسی پر بیٹھنے لگی تو اُس نے پیچھے مڑ کر پہلے تعین کیا کہ کُرسی وہاں موجود ہے یا نہیں اور پھر بیٹھ گئی..اس پر ایک دل جلی شہزادی نے کہا..''بس یہی فرق ہوتا ہے عام سے لوگوں اور شاہی خاندانوں کے افراد میں..عام لوگوں کو یقین نہیں ہوتا کہ کُرسی وہاں پر ہو گی جب کہ نیلے خُون کے حامل شاہی افراد کبھی مڑ کر نہیں دیکھتے، تعین نہیں کرتے، اُنہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹھیں گے تو کُرسی وہاں پر ہو گی..''

وزیراعظم کی سونے کے رنگوں سے مزین کُرسی کے عقب میں ایک اور نہائت شاہانہ نشست تھی اور جب میں اُس پر بیٹھ کر ایک تصویر اتروانے کو تھا تو شوکت کہنے لگے، نہیں تارڑ صاحب.. یہ نشست ملکہ برطانیہ کے لئے مخصوص ہے.. اس پر کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں، یہ ہمیشہ خالی رہتی ہے.. آسٹریلوی اپنے ماضی سے جُڑے رہنا چاہتے ہیں، وہ ملکہ کی غیر موجودگی کو بھی ایک فخر سمجھتے ہیں..

مُجھے بے حد قلق ہوا کہ اتنی بوڑھی گھاس پھونس ملکہ کے لئے بھی یہ لوگ اتنی تعظیم رکھتے ہیں، جس نے شہزادی ڈیانا کو کبھی قبول نہ کیا، حسنات اور دودی ایسے مسلمان نوجوانوں کے ساتھ عشق میں مبتلا ہونے کو قبول نہ کیا کہ یہ عین ممکن تھا کہ اس کے نتیجے میں شائد انگلستان کا بادشاہ ایک مُسلمان ہو جاتا.. تو ذرا تصور کیجئے کہ کیا ہو جاتا.. بادشاہ سلامت اذانیں دے رہے ہیں، روزے رکھ رہے ہیں اور رمضان کے آخر میں بکنگھم پیلس کی چھت پر کھڑے ہو کر عید کا چاند تلاش کر رہے ہیں..

پارلیمنٹ کے ایک وسیع ہال میں آسٹریلوی مصوروں کی شاہکار تصویریں نمائش پر تھیں، بے شک یہ مصور میرے لئے تو غیر معروف تھے لیکن ہمارے ہاں جس قسم کی تصویر کشی کر کے لوگ مشہور ہو جاتے ہیں، یہ مصور اپنے کمال فن میں اُن سے کہیں برتر اور اعلیٰ تھے..

پارلیمنٹ ہاؤس کے نمائندگان کے لئے مخصوص کیفے ٹیریا میں شوکت صاحب نے ناشتے کی میزبانی کی.. اگرچہ چاکلیٹ کیک اور دیگر خوراکیں ذائقے میں جواب نہیں رکھتی تھیں لیکن وہاں جو کافی پینے کے لئے ملی وہ عجیب خمار آور مشروب تھا.. اس دوران میں نے شوکت کو بتایا کہ میں 1975ء میں پی ایل او میں شرکت کے لئے بیروت جا پہنچا تھا اور خانہ جنگی میں ہلاک ہوتے ہوتے بچا تھا.. خلیل جبران کا بھی بہت تذکرہ ہوا.. مُجھے بھی اُس کی کُچھ تحریریں یاد تھیں اور شوکت حیران ہوتا تھا کہ کیسے اوائل عُمری میں خلیل جبران میرے حواس پر چھا گیا تھا.. اُس کی درجنوں کتابیں انگریزی اور اردو میں میری لائبریری کے شیلفوں پر سجی تھیں اور ابھی پچھلے دنوں اُن میں گھُن لگ گئی..

اور میں نے اجتناب کیا کہ شائد وہ اس معاملے میں بے حد حساس ہو، میں نے مسجد قرطبہ میں ملنے والی لبنانی ناژلا سعد کا کُچھ تذکرہ نہ کیا جو خلیل جبران کے شعروں کے سحر میں گرفتار میری قُربت میں آ گئی تھی کہ واللہ مستنصر باللہ، خلیل جبران نے یہ تو نہ کہا تھا..

ناشتے کے بعد شوکت صاحب ہمیں اپنے پارلیمنٹ کے مخصوص چیمبر میں لے گئے جس کی کھڑکی بقول جاوید نظر سڈنی کے سب سے خوبصورت منظر پر کھُلتی تھی.. دیواروں پر شوکت صاحب کی حیات کی درخشاں

تصویریں تھیں اور اُن کے درمیان میں مہاتما گاندھی گول شیشوں والی عینک پہنے مسکرا رہے تھے..

''مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے جب کوئی پاکستانی مہمان میرے چیمبر میں آتا ہے تو مہاتما گاندھی کی پورٹریٹ دیکھ کر بدک جاتا ہے.. یہ میری ذاتی پسند ہے.. گاندھی وازاے مین آف پیس، جس شخص کے مداحوں میں لیوٹالسٹائی شامل ہو.. اس صدی کے سب سے عظیم راہنما نیلسن منڈیلا اُسے مُرشد مانتے ہوں کہ معاف کر دو، درگذر کر دو مجھے گاندھی نے سبق دیا تو اُس کی عظمت میں کچھ شک ہے؟''

''شوکت صاحب.. میں ذرا مختلف اور بہت سے لوگوں کی نظروں میں مخدوش سا پاکستانی ہوں.. گاندھی جی کے ساتھ ہماری ذاتی، قومی رنجشیں اور نظریاتی اِختلاف اپنی جگہ.. لیکن بہرطور وہ ایک عظیم اور حیرت انگیز شخص تھا.. جس نے مرن بھرت رکھ کر پاکستان کے حصے کا خزانہ کراچی بھجوا کر ہماری سلطنت کو مسمار ہونے سے بچالیا، مُسلم کش فسادات کے موقع پر سہروردی کے ساتھ بنگال کا دورہ کر کے مسلمانوں کی جانیں بچائیں... اور پھر نتھو رام گاڈسے نے اُسے صرف اس لیے قتل کر دیا کہ یہ شخص مسلمانوں کا دوست ہے، ایک غدار ہے.. اس لئے میں بھی کسی حد تک مشروط طور پر ہی سہی گاندھی کا مداح ہوں..''

شوکت مسکرانے لگا.. آپ تو اور طرح کے پاکستانی ہیں..

اور تب میں نے یونہی تذکرہ کیا کہ میں گاندھی کے پوتے راموگاندھی سے دِلّی میں ملا تھا اور آسٹریلیا میں آنے سے کُچھ روز پیشتر میری 75 ویں سالگرہ کے موقع پر درجنوں تقاریب میں سے ایک ایسی تھی جب گلزار براہ راست ممبئی سے مجھے مبارکباد کہتے میرے اعزاز میں نظمیں پڑھتے تھے تو گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی بھی اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے کہتے تھے کہ میری پوتی سپریا تارڑ صاحب کی کتابوں اور ناولوں کی شیدائی ہے..

شوکت مُسلمین کو یقین نہ آتا تھا.. کیا واقعی؟

میں عرض کر چکا ہوں کہ جب شوکت نے یہ کہا کہ وہ ایک آسٹریلوی خاتون کے ہمراہ پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں اور اُنہوں نے معذوروں کے لیے بہت سی وہیل چیئرز تحفے میں پیش کی تھیں تو میمونہ چوکنی ہو گئی... چنانچہ موقع غنیمت جان کر نہائت بے چارگی سے کہنے لگی ''شوکت صاحب میں لاہور میں معذوروں کی بحالی کے ایک ادارے میں جز وقتی طور پر کام کرتی ہوں اور ہمیں وہاں جدید نوعیت کی وہیل چیئرز کی شدید کمی ہے خاص طور پر ایسی وہیل چیئرز جن پر بیٹھ کر معذور افراد مختلف کھیلوں میں شریک ہو سکیں تو کیا آپ مدد کر سکتے ہیں؟''

میں میمونہ کے اس رضا کارانہ کام کی بے حد قدر کرتا تھا لیکن اُس کی ایک عادت کبھی کبھار مجھے بیزار

سی کر دیتی تھی، وہ ہالینڈ میں ہو، نیویارک میں یا فلوریڈا کے کسی ڈنر میں شریک ہو تو کھانے کے فوراً بعد اپنا کشکول دراز کر دیتی تھی کہ پلیز صرف سات ہزار روپے میں ایک معذور بچہ سال بھر کے لئے تعلیم حاصل کر سکتا ہے، ایک ایسے بچے کو گود میں لے لیجئے..ایک چھوٹا سا بچہ ہے جس کے دونوں بازو نہیں ہیں اُس کے لئے میکانکی بازو خریدنے ہیں، صرف ڈیڑھ لاکھ درکار ہیں..اور وہیل چیئرز..

''میڈم تارڑ آپ پاکستان پہنچ کر اپنے اس ادارے کے کوائف مجھے ای میل کر دیجئے انشاء اللہ آسٹریلوی حکومت کے تعاون سے ہم مددگار ثابت ہو جائیں گے۔''

شوکت ایک خوش شکل چینی یا کوریائی خاتون سے بیاہے ہوئے ہیں، اور اُن کا ایک بیٹا بھی ہے جو اپنے ماں باپ کے ناک نقشے کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے..شوکت لبنانی ہونے کے باوجود نیو ساؤتھ ویلز میں مقیم تمام مُسلمانوں کے متفقہ ترجمان ہیں اور اُن کے حقوق کی پاسداری کے لئے دن رات ایک کرتے ہیں، کہنے لگے..''یہاں یہودیوں کی تعداد ساٹھ ہزار کے قریب ہے لیکن وہ سب کاروباری صلاحیتوں سے مالا مال نہائت منظم، متحد اور پُراعتماد ہیں اور معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں جب کہ ہم مسلمان تین چار لاکھ ہونے کے باوجود بکھرے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں، فرقہ پرستی عروج پر ہے، تنظیم نام کو نہیں اور فروعی اختلافات میں اُلجھے رہتے ہیں، ہم اگر متحد ہو جائیں تو یہاں ایک بڑی قوت بن کر ابھر سکتے ہیں..''

میں نے کہا''نہیں لیکن بے اختیار یہی کہنا چاہتا تھا کہ لو ہم بھلا کیوں متحد ہو جائیں، ہمارا دماغ خراب ہے کہ یہودیوں کی پیروی کریں..ہم لڑتے جھگڑتے، جلوس نکالتے اور دنگا فساد کرتے ہی اچھے لگتے ہیں..''

شوکت مُسلمین کی خواہش تھی کہ میں اُن کی ملاقاتی کتاب پر اپنے تاثرات تحریر کروں اور میں نے بخوشی اُن کی مہمان نوازی اور برادرانہ اُلفت کے شکریئے کا اظہار کیا..اُنہوں نے مجھے ایک نہائت خوبصورت کلاک تحفے میں پیش کیا جو آسٹریلیا کے نقشے پر ثبت تھا..

یہ کلاک میری سٹڈی ٹیبل پر ٹک ٹک کر رہا ہے اور مجھے شوکت مُسلمین کے ناشتے اور اُن کے چیمبر کی کھڑکی سے دکھائی دینے والے سڈنی کے سب سے دلکش نظارے کی یاد دلاتا ہے..

○○○○○

''وولوگانگ..عجیب گانگ..گانگ کی شام اور ضمیر جعفری مسکراتے ہوئے''

جاوید نظر اپنی شلوار کے پائینچے ٹخنوں سے اوپر اڑسنے کی کاوش کرتا، ریش سنوارتا، مسلسل مسکراتا درخواست کرتا بلکہ اصرار کرتا تھا کہ تارڑ صاحب سڈنی سے ایک مختصر مسافت پر واقع وولوگانگ کیا ہی کمال کا ساحلی قصبہ ہے، سمندری ساحلوں سے مزین آبادیاں ہیں، آبی پرندے کیں کیں کرتے گیت گاتے ہیں اور وہاں ایک ایسا مقام ہے جہاں سمندر کے پانی زور کرتے چٹانوں میں داخل ہو کر ایک شگاف میں سے ایک جھاگ دار فوارّے کی مانند آسمانوں کو جا بھگوتے ہیں اور سیاّح حضرات بلکہ خواتین اُس میں بھیگ کر خوب خوب چیخیں مارتی ہیں، نہائت ہی قابل دید مقام ہے، وہاں چلنا ہے..میں کچھ زیادہ شائق نہ ہو سکا کہ مجھے یہ نام وولوگانگ کچھ عجیب سا لگا..اور نہ ہی مجھے کسی آبی فوارّے کو چھوٹتے دیکھنے کی خواہش تھی البتہ اگر خواتین اُسے دیکھ کر چیخیں مارتی تھیں تو ایسی خواتین کو دیکھ لینے میں کچھ حرج نہ تھا، بہرطور جاوید کی خواہش میرے لئے ایک حُکم کا درجہ رکھتی تھی..

''علاوہ ازیں چٹانوں میں سے بلند ہوتے اُس فوارّے کو دیکھنے کے بعد ہم ضمیر جعفری صاحب کے ایک بھتیجے ڈاکٹر صاحب کے ہاں ڈنر کے لئے مدعو کئے گئے ہیں جن کی ایک وسیع میڈیکل ایمپائر ہے اور وہ پچھلے چالیس برسوں سے وولوگانگ میں مقیم ہیں..''

مجھے حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص عُمر عزیز کے چالیس برس صرف وولوگانگ نام کے قصبے میں بھی گذار سکتا ہے چاہے وہ ضمیر جعفری صاحب کا گمشدہ بھتیجا ہی کیوں نہ ہو..

وولوگانگ بے شک ایک دل کش بستی ہے جس میں سے ہم اس جہان کی مانند سرسری گذرے..

کہیں نہ رُکے اگر چہ وہاں رُکنے کے کُچھ مقام تو تھے پر وہ سب کے سب غیر شرعی تھے..اور آبادی کے آخر میں جہاں سے سمندر شروع ہوتا تھا وہاں چٹانوں میں سے ایک سمندری پانیوں کا فوارّہ سا کبھی کبھار تو چُھوٹتا تھا پر ایسا نہیں تھا کہ اُسے دیکھنے کے لئے انسان وولوگانگ ہو جائے..

شام ہونے لگی..ریلنگ پر براجمان دو آبی پرندوں سے میں نے کُچھ باتیں کیں، اُنہیں بتایا کہ میں اُن کے رشتے دار لونگ سٹون سی گل کا مداح ہوں اور پھر جاوید سے دریافت کیا کہ حضرت اب کہاں اور کدھر..

معلوم ہوا کہ جاوید بے خبر تھا کہ اب کہاں اور کدھر، اُسے کھوج کرنی تھی کہ ہمارے میزبان کا گھر کہاں ہے..اور ہمیں ایک اور مہربان کے گھر جانا تھا جو ہمیں اُس گھر تک لے جا سکتے تھے جہاں ہم ماشاءاللہ ڈنر کے لیے مدعو تھے..وہ مہربان ایک ویران سے علاقے میں ایک ایسے سٹور کے مالک تھے جہاں سکول کے بچّوں کی وردیاں فروخت ہوتی تھیں..اور اُس سٹور کے پچھواڑے میں بالائی منزل پر اُن کی رہائش گاہ تھی..

جاوید نظر بالائی منزل پر گئے اور پھر ہم دونوں میاں بیوی کو پکارا کہ آ جاؤ..میں اپنی عُمر کے ہاتھوں مات کھا چکا تھا، بے حد تھکا ہوا تھا، میری صرف ایک ہی خواہش تھی کہ میں واپس سڈنی اپنے بستر پر ڈھیر ہو جاؤں لیکن جاوید کہتا تھا کہ آ جاؤ..

چنانچہ ہم آ گئے..

ایک نہائت ہی اسلامی ماحول کے کمرے میں ہمیں بٹھا دیا گیا اور ہم اس عظیم شخصیت سے ملے جن کا نام مُجھے یاد نہیں، وہ چالیس برس پیشتر ساہیوال سے یہاں منتقل ہوئے تھے اور بچّوں کی وردیاں سی سی کر بے حد خوشحال ہو گئے تھے، آسٹریلیا میں اتنی زندگی بسر کرنے کے باوجود وہ اور جنل حالت میں جُوں کے تُوں تھے..پہلے تو اُنہوں نے کمرے میں جانماز بچھا کر ہمیں نماز پڑھنے کی دعوت دی اور پھر چائے کی پیشکش کی اور جب میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ سَر ابھی ہم کھانے کے لئے جا رہے ہیں تو نہائت شفقت سے مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''آپ کو کھانا بھی کھلا دیں گے، فکر کیوں کرتے ہیں؟''

اور پھر اُنہوں نے پوچھا ''اچھا جی آپ کیا کرتے ہیں؟''

اس دوران میمونہ اُن کے زنان خانے سے باہر آ چکی تھی، سرگوشی میں بولی ''یہ جاوید ہمیں کہاں لے آئے ہیں، میں نے کسی ڈنر پر نہیں جانا، واپس سڈنی چلتے ہیں..''

بہر طور وہ ساہیوالی بزرگ ہمارے راہنما ہو گئے اور بالآخر ہم وہاں پہنچے جہاں ہمارے ''اعزاز'' میں ڈنر کا اہتمام متوقع تھا..

ہمارے میزبان ڈاکٹر صاحب نہائت دھان پان سے تھے، لحیم شحیم ضمیر جعفری کے اگر بھتیجے تھے تو

بے حد ناتواں سے تھے..انہوں نے ہمیں وصول کیا اور پھر اپنے شاندار میڈیکل کامپلیکس کے اندر لے گئے جس کی چکاچوند اور رونق نے ہمیں حیران کر دیا، یہ ایک چھوٹا سا روشن شہر تھا..

تھکاوٹ ایک سومو پہلوان کی مانند مجھے کسی بھی لمحے چاروں شانے چت کر سکتی تھی اور میری بدنی بیزاری عروج پر پہنچ چکی تھی، رات ہو چکی تھی اور ہم ابھی تک صرف ایک ڈنر کے لئے دربدر ہوتے تھے..ڈاکٹر صاحب ہمیں خوش آمدید کہہ کر کہیں مشغول ہو گئے تو میں نے اُن کے کامپلیکس کی ایک پھرتیلی ڈاکٹر صاحبہ کو متوجہ کر کے کہا.''میڈم..کیا یہ ممکن ہے کہ میں کہیں بیٹھ سکوں..'' تو اُنہوں نے نہائت کاروباری خوش دلی سے کہا ''آپ کہیں بھی بیٹھ جائیے..ہم اپنے مریضوں کا خیال رکھتے ہیں..''

تب معلوم ہوا کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے گھر ڈنر پر مدعو نہیں بلکہ ہمیں اسی کامپلیکس کے ایک پرائیویٹ ویٹنگ رُوم میں بٹھا کر کھلا پلا دیا جائے گا..اول تو میں اس وولوگانگ میں آنے کا کچھ شوق نہ رکھتا تھا اور اگر آ ہی گیا تھا تو اس تھکن اور بڑھاپے کی بے چارگی کی حالت میں ایک بزنس پیلس میں بیٹھنا..ایک پبلک سپاٹ میں چاہے وہ کتنی ہی آرام دہ کیوں نہ ہو.. مجھے گوارا نہ تھا..چنانچہ میں ظاہر ہے کہ ایک بندہ اور بشر ہوں جس کا فیوز اڑ سکتا ہے..

اور وہ اڑ گیا..

ڈاکٹر صاحب اپنی پروفیشنل مصروفیات میں سے جب نمودار ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ سَر آپ میرے لئے رات کے کھانے کا بندوبست کر رہے ہیں جو میرے لئے ایک اعزاز ہے لیکن میں یُوں کاروباری نوعیت کی عمارتوں میں ڈنر نہیں کر سکتا..آپ کا گھر نہیں ہے..ورنہ میں تو سڈنی کا مسافر ہوتا ہوں..''

اور میں اُن کے تحمل اور متانت کا قائل ہو گیا جب اُنہوں نے خوراک کے بندوبست جتنے بھی تھے، اُن کا رُخ اپنے گھر کی جانب کر دیا..

ویسے اُنہوں نے زیرلب یہ کہا کہ میں تو پاکستان سے آنے والے تمام ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو یہیں کھانا کھلا دیتا ہوں اور آج تک کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا تو میں نے بھی زیرلب کہا''اُن میں سے کوئی تارڑ نہ تھا..''

ڈاکٹر صاحب کے ڈرائنگ روم میں ضمیر جعفری کی ایک مسکراتی ہوئی فریم شدہ تصویر تھی..

وہاں وولوگانگ اور اس کی نواحی آبادیوں میں مقیم بہت سے پاکستانی مجھے ملنے کے لئے جمع تھے جن کی اکثریت ڈاکٹروں کی تھی، اُن میں سے کچھ میری تحریروں کی پہچان رکھتے تھے..اُن سب کی جو مجھے جانتے تھے اور نہیں جانتے تھے رفاقت پُرلطف رہی اور اُن میں سے ایک صاحب نے پُوچھا کہ..آپ کرتے کیا ہیں..

یہ وولوگانگ کا کمال تھا کہ ایک ہی دن میں مجھے دوسری مرتبہ پُوچھا گیا کہ میں کرتا کیا ہوں..

بہرطور طعام نہائت وسیع اور شاندار تھا..

کھانے کے بعد مجھے برابر کے ڈرائنگ رُوم میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت خواتین کی جانب سے موصول ہوئی اور اُن میں سے بیشتر کسی نہ کسی حوالے سے میری مدآح تھیں..ایک فوٹو سیشن ہوا اور میں واپس مردانے میں آ گیا..

وہ بھولے سے بچّوں کی وردیاں مینوفیکچر کرنے والے باریش ساہیوالی صاحب بھی اس محفل میں شریک تھے..

کسی ایک ڈاکٹر نے میرے سفرناموں اور ناولوں کے حوالے سے گفتگو کی تو وہ حیرت زدہ ہو کر بولے ''اچھا آپ کتابیں لکھتے ہیں؟''

اور پھر کسی نے ٹیلی ویژن پر میری مارننگ ٹرانسمشن کی توصیف کی تو ساہیوالی بابا کہنے لگے ''اچھا آپ ٹیلی ویژن پر آتے ہو..ویسے آپ کا پُورا نام کیا ہے..''

ڈرائنگ رُوم کے کونے میں ایک تپائی پر آویزاں ضمیر جعفری کی تصویر مجھ پر مسکراتی تھی..میں جب تقریباً چالیس برس پیشتر اپنے ناول ''پکھیرو'' کی افتتاحی تقریب کے لیے راولپنڈی گیا تھا اور اسلام آباد میں اپنے بھائی مبشر کے ہاں قیام کیا تھا تو جعفری صاحب میری آمد کی خبر سُن کر ایک کیک لے کر اُس گھر میں تشریف لائے تھے..اُنہوں نے مجھے اپنی سنجیدہ شاعری کا مجموعہ ''جزیروں کے گیت'' اپنے دستخطوں کے ساتھ عنائت کیا تھا، میرے بارے میں ''اردو ادب میں سفیدے کا درخت'' کے عنوان سے اُس محفل میں ایک توصیفی مضمون پڑھا تھا..اور آج..جو لوگ یہاں جمع تھے، مجھ سے محبت کرنے والے تھے میں اُنہیں اپنی اِن یادوں میں شریک نہیں کر سکتا تھا..

ضمیر جعفری مسکراتے تھے..میں نے کہا تھا ناں کہ تم اردو ادب میں سفیدے کے درخت ہو جو تیزی سے بڑھتا ہے اور اُس کی شاخیں پھیلتی جاتی ہیں تو دیکھو آج تمہاری شاخیں آسٹریلیا تک آ گئی ہیں..

ضمیر جعفری مسکراتے چلے جاتے تھے..

اور ہم وولوگانگ سے واپس سڈنی آتے چلے جاتے تھے..

نہ بول پنچھی مورے انگناں، پنچھی جا رے جا..

آسٹریلیا بھر کے تمام پنچھیوں، پکھیروؤں، رنگین طوطوں اور پرندوں نے ایکا کر رکھا تھا کہ اُنہوں

نے جب تک میں وہاں ہوں، بولنا ہے..کُوکنا ہے.. مجُھے سونے نہیں دینا..
اور اُس شب بھی میرے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا..اُنہوں نے رات بھر مجُھے سونے نہ دیا..
اور جب بے خوابی ایک اذیت ہونے لگی تو میں نے زیرلب اُنہیں ڈانٹا ''چُپ ہو جاؤ..''
اور وہ چُپ ہو گئے..اپنی چونچیں پروں میں روپوش کر کے چُپ ہو گئے..اور مجُھے نیند نصیب ہو گئی..

OOOOOO

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

اڑتیس برس بعد تہران کے سُکھدیپ سے ملاقات..اور وہاں رُوپی تھی، شیرا تھا''

میرے اندر ایک عجیب بے کلی اور اداسی گھر کرتی تھی..خواہش اور خوف کی آمیزش سے جو شراب کشید ہوتی ہے میں اُس کے مسرت بھرے ملال کے خمار میں تھا کہ میں پورے اڑتیس برس کے بعد سکھدیپ سے ملنے جا رہا تھا..

جیسے کوئی مدت سے بچھڑ چکا عشق خاص ہو، کبھی اُس کی آنکھوں میں صرف تمہارے لئے الفت اور دیوانگی کی بادبانی کشتیاں تیرتی تھیں، اُس کے رخساروں پر صرف تمہیں دیکھنے سے شفق کی سُرخی طلوع ہوتی تھی اور جس کے ہونٹ وہ پھڑ پھڑاتی تتلیاں تھے جنہیں صرف تمہارے ہونٹوں پر اتر کر آرام آتا تھا تو پھر زمانے گذر جائیں، خون کی گردش اور آنکھوں کی روشنی مدھم پڑتی جاتی ہو تو اُس کے پیغام آ جائیں، جسے چین نہ آئے کبھی بھلا کے مجھے اور پھر آپ اُس سے اتنے برسوں بعد ملنے جاتے ہوں، بس یہی کیفیت تھی جب ہم سینٹ آئیوز کی جانب سفر کرتے تھے، اڑتیس برس بعد اُسے ملنا تھا، اُسے دیکھنا تھا..

میں پاکستان سے کئے گئے اُس فون کی تفصیل بتا چکا ہوں جب میں نے سکھدیپ کو اطلاع دی تھی کہ میں یکم اپریل کو سڈنی پہنچ رہا ہوں تو اُس نے ماننے سے انکار کر دیا کہ خالصے کو اپریل فول بناتے ہو چوہدری تم نے کہاں آنا ہے..

اور آسٹریلیا کے ساحلوں پر اترتے ہی جاوید کے مہیا کردہ سیل فون پر میں نے پہلا فون سکھدیپ کو کیا اور اُس نے جواب میں کچھ زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ نہ کیا اور پھر کہنے لگا..''چوہدری پچھلے ہفتے تم نے مجھے اپریل فول بنانے کی کوشش کی تو یار مجھے اچھا نہ لگا..ایسے نہ کیا کر..میرا دل کمزور ہو رہا ہے، دل لگی نہ کیا کر..تُو نے

کہاں آنا ہے چوہدری۔''

تب میں اُس بے وقوف سردار کی سادگی پر مسکرا دیا ''اوئے سکھ دیپا، ذرا اپنے فون پر میرا نمبر تو چیک کر۔۔ میں پاکستان سے نہیں سڈنی سے بول رہا ہوں۔''

اس دوران پس منظر میں ایک کُتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور پھر سکھ دیپ کی آواز آئی۔''اوئے شیر اسنگھ کہتا ہے کہ تو واقعی سڈنی میں ہے'' وہ ہنسنے لگا۔۔

''اور یہ شیر اسنگھ کون ہے؟''

''میرا کتا ہے چوہدری۔۔ واقعی تو سڈنی میں ہے۔۔ کہاں ہے۔۔ جہاں بھی ہے میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔۔ اوئے چوہدری تُو تو سچ مچ آ گیا ہے۔۔''

میں نے اُسے اپنے شیڈیول کے بارے میں بتایا اور وعدہ کیا کہ ذرا ان ادبی مصروفیات سے فارغ ہولوں۔۔ کُچھ دوستوں، چاہنے والوں سے ملاقات کرلوں پھر میں بس تمہارے ہاں منتقل ہو کر پڑا رہوں گا جب تک کہ تم بیزار ہو کر یہ نہ کہہ دو کہ۔۔ چوہدری تم نے پاکستان واپس نہیں جانا۔۔ میں ذرا فارغ ہولوں۔۔

روزانہ سکھدیپ کا فون آتا۔۔ کہاں ہو۔۔ دفع کرو سب کو، یہاں میں، رُوپی اور شیرا تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔۔

ایک روز سکھدیپ کا نہائت ہی سنجیدہ نوعیت کا فون آیا۔۔ چوہدری تو نے میرے پاس آنا ہے تو میرے تین سوال ہیں، باری باری ان کے جواب دو۔۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ تم وِیج ہو یا نان وِیج ہو۔۔ یعنی صرف سبزیاں کھاتے ہو یا گوشت خوری کے بھی شوقین ہو، یہ سوال رُوپی کی جانب سے ہے۔۔ میں نے کہا، سکھدیپ ہماری جو یاریاں تھیں تمہیں یاد نہیں تم نے مجھے قیمے کے پراٹھے کھلائے تھے، جس نوعیت کا تُو نام نہاد سکھ ہے، میں بھی تقریباً ایسا ہی مسلمان ہوں اور ہمارے بڑے غلام علی خان کو جب مدراس میں ایک طعام کے لئے مدعو کیا گیا تو وہاں صرف سبزیاں تھیں اور شوربے تھے اور وہ ہر پیالی میں انگوٹھا ڈبو کر کہتے تھے کہ شائد اس کی تہہ میں کوئی بوٹی ہو اور اُنھوں نے کہا تھا کہ میاں ہم یہ گھاس پھونس کھا کر گانا نہیں گا سکتے، جب تک ہم دیسی گھی میں تیار کردہ قورمہ تناول نہ فرمائیں ہمارے گلے سے سُر برآمد نہیں ہوتا۔ لیکن سکھدیپ اگر اب تمہارے گھر میں ماس کی مناہی ہے تو میں گذارہ کرلوں گا۔''

''نہیں نہیں۔ صرف رُوپی گائے کا گوشت نہیں کھاتی، اور میں تو بیف سٹیک کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اچھا دوسرا سوال یہ ہے کہ تُو دارو پیتا ہے؟ چل نہ جواب دے اور آخری سوال یہ ہے کہ کیا تم کتوں کو پسند کرتے ہو۔''

تو میں اُس کے اس سوال پر قدرے محظوظ ہوا ''ہم کسی زمانے میں کتّوں کے بے حد گرویدہ ہوتے تھے، ہم نے یکے بعد دیگرے تین السیشن گھر میں رکھے اور اُن کے نام درجہ بہ درجہ..شیری وَن..شیری ٹُو اور شیری تھری تھے، پھر مُجھ میں اور مُونا میں دیکھ بھال اور خوراک بروقت مہیا کرنے اور اُنہیں سیر کرانے کی سکت کم ہوگئی..لیکن یہ درمیان میں کتے کہاں سے آ گئے..''

سُکھدیپ بے حد سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا..''میرا ایک مسلمان دوست ہے مجید، اُس نے بتایا تھا کہ ہم مسلمان کُتّوں کو پسند نہیں کرتے، کُتّوں والے گھر میں بھی رہنا پسند نہیں کرتے تو میں نے سوچا تھا کہ جتنے روز تم میرے گھر میں قیام کرو میں شیرا کو رُوپی کے ماں باپ کے گھر بھیج دیتا ہوں..''

''سُکھدیپ مُجھے اور مُونا کو تمہارے شیرا کی موجودگی پر کُچھ اعتراض نہ ہوگا۔ اگر وہ بے جا طور پر فرینڈلی ہو کر ہمیں چُومنا چاٹنا نہ شروع کر دے..ایک سکھ کا کتا بھی تو سکھ ہوتا ہے، اُس کا کیا اعتبار..''

گئے وہ دن جب پسینہ گلاب تھا..جب ہم دونوں انگلستان کے ساحلی قصبے ساؤتھ اینڈ آن سی میں کچی جوانیوں، نم آلود خوابوں اور پہلے تجربوں کے بخار آلود بخارات میں تھے..

؎ جب پُوری دنیا جوان ہوتی ہے اے لڑکے..
ہر درخت سرسبز اور ہر بطخ ایک راج ہنس ہوتی ہے..

قصبے کی ہائی سٹریٹ پر کھلکھلاتی لڑکیاں، ساحل پر سُورج تاپتی لڑکیاں، سب کی سب راج ہنس دکھائی دیتی تھیں..

میں اپنے ابا جی کے خط کے ایک فقرے ''میں اب بوڑھا ہو رہا ہوں، مُجھے تمہاری موجودگی کی ضرورت ہے، اگر آ سکو تو آ جاؤ..'' سب کچھ، برطانوی شہریت، جینس کا سنہرا پن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ گیا..سُکھدیپ سے رابطہ منقطع ہوگیا..اور پاکستان میں، میں رہین ستم ہائے روزگار رہا لیکن جہاں گردی کے خیال سے غافل نہ رہا، آٹھ برس بعد میں نے پھر سے رختِ سفر باندھا اور زمینی راستے سولہ سترہ ملکوں کی خاک خوب چھانی اور جب تہران سے گذرا تو وہاں سُکھدیپ سے ملاقات ہوگئی..بقیہ داستان ''نکلے تری تلاش میں'' اور ''خانہ بدوش'' میں تفصیل سے درج ہے..

آخری بار 1975ء میں ''خانہ بدوش'' کے زمانوں میں جب میں اُن بے دروز مانوں کے نظام کو بدل دینے کی خواہش کرتا تھا، چے گویرا کی مانند اپنی حیات کو ظُلم کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے وقف کر دینا چاہتا تھا، تخت گرانا چاہتا تھا اور تاج اُچھالنا چاہتا تھا تاکہ راج کرے گی خلق خدا..تو میں لبنان جا رہا تھا پی ایل او

میں شمولیت کی خاطر تا کہ میں فلسطینیوں کا ساتھ دے سکوں، اسرائیل کے خلاف جدوجہد کر سکوں..تا کہ میری زندگی کا کوئی مقصد تو ہے پر یہ سب خواب سراب ہوئے..

سکھدیپ کے ساتھ 1975ء میں میری آخری ملاقات ہوئی اور پھر امام خمینی کی آمد سے پیشتر وہ آسٹریلیا منتقل ہو گیا..

ایک آہستہ خرام کار جسے مولانا جاوید نہائت چابکدستی سے ڈرائیو کر رہے تھے مجھے سکھدیپ کی جانب..اڑتیس برس کی جُدائی کے بعد لئے جاتی تھی..

نشے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالم..

اور اس یار کی یادوں کا عالم واقعی نشے سے کم تو نہ تھا..

دریائے خراج کے کنارے ایک سایہ دار اوپن ایئر ریستوران کے تالاب میں مچھلیاں اُچھلتی تھیں اور سکھدیپ اپنے آپ کو بھگوتا اُنہیں پکڑتا تھا کہ بس یہ مچھلی ہماری ٹیبل پر فرائی شدہ حالت میں پیش کی جائے..

ایک ایرانی اپنی خوش نظر اور خوش بدن محبوبہ کو سامنے بٹھا کر حافظ کی غزلیں سنتا تھا اور کبھی وجد میں آ کر اُس کے گرد رقص کرنے لگتا تھا..اور ایک بار سکھدیپ بھی جذباتی ہوا اور اِک نعرۂ مستانہ بُلند کر کے اُس کے گرد ناچنے لگا..بھنگڑا ڈالنے لگا..یہ ہوتا تھا سکھدیپ..اور کبھی وہ تہران کلب کا وہ شاہانہ ہال میرے لئے کھلوا دیتا تھا اور ہم وہاں سویر تک بیٹھے رہتے تھے جو شاہِ ایران کے لئے مخصوص تھا..

لیکن تب 1975ء میں بھی مجھے محسوس ہوا کہ سکھدیپ کے سکھ کے چراغ کچھ بجھتے جاتے ہیں کہ اُس کی گھر والی جس نے اُسے دھمکی دی تھی کہ تم کیسپئن سمندر کی شب میں اپنے پاکستانی یار کے ساتھ نہیں کسی عورت کے ساتھ ہو تو ابھی واپس تہران آ جاؤ..ورنہ میں چلی پٹیالے..

تو وہ..پٹیالے جا چکی تھی..مر چکی تھی..

اُس کے سکھ کا پہلا دیپ پٹیالے چلی جانے والی نے بجھایا اور پھر اُس کی شخصیت مدھم پڑ گئی، وہ بجھنے لگا..

میرے اور سکھدیپ کی یادوں، یاریوں اور دلداریوں کے قصے نصف صدی سے زائد کے عرصے میں بکھرے ہوئے ہیں، اتنا وسیع ذخیرہ ہے کہ تفصیل میں جاؤں تو زندگی مختصر معلوم ہو گی..

سینٹ آئیوز کا رہائشی علاقہ ایک سرسبز خاموش باغ بہاراں ہے، جہاں اہل ثروت ہی قیام کر سکتے ہیں..زیادہ تر جنوبی افریقہ سے منتقل ہونے والے متمول یہودی ہیں جو اس کے شاہانہ گھروں میں رہائش رکھتے ہیں اور یہودی ہمیشہ اچھے ہمسائے ثابت ہوتے ہیں..سکھدیپ نے اپنا موجودہ گھر آج سے اکتیس برس پیشتر خریدا تھا..جب یہ علاقہ اتنا آباد اور مہنگا نہ ہوا کرتا تھا..

ایک ہلکی پھوار اترتی چلی جاتی تھی..اور ہم جیسے سبزے اور ہریادل کی ایک سُرنگ میں سفر کرتے جاتے تھے اور آس پاس جو گھر تھے اور اُنہیں روپوش کرتے جو شجر اور خوش نظر ہرے کچور بُوٹے تھے وہ اس پھوار میں بھیگتے تھے..میرے اندر اُسے اتنے برسوں بعد ملنے کا ہیجان نہ تھا، بس گذر چکے وقتوں کا ایک ملال تھا جسے پھوار کے باریک آنسو دو چند کرتے تھے..

ہماری کار بھیگتی ہوئی مدھم ہوئی اور بائیں جانب ایک بظاہر ویران رہائش گاہ کے اندر داخل ہو کر رُک گئی..داخلے کے راستے کے دونوں جانب جنت کے رنگین پرندے ''برڈز آف پیراڈائز'' کے پھول اپنے پر پھیلائے جیسے پھوار میں مزید رنگین ہوتے پھڑ پھڑاتے تھے اور اُن کے پس منظر میں سرو کا ایک عجیب سرشار اور آپس میں گتھم گتھا درخت تھا جو ایک گھنے سبزے سے لپٹا ایک مینار کی مانند بلند ہوتا تھا..

وہ میری جانب سر جھکائے چلتا ہوا آ رہا تھا..

اڑتیس برس بعد تہران میں ملاقات کے بعد آج آسٹریلیا کے شہر سڈنی کے سینٹ آئیوز علاقے کی ہریادل میں، ہلکی پھوار میں بظاہر ایک ویران گھر میں سے چلتا ہوا سکھدیپ میری جانب چلتا ہوا آ رہا تھا..

جیسے گذر چکے زمانے اپنے بوجھ سے جُھکے میری جانب چلتے آ رہے ہوں..

ایسے وہ جُھکا جُھکا شرمندگی سے مسکراتا میری جانب چلا آ رہا تھا..

اُس کی گھنی داڑھی سرو کے اُس درخت کی مانند گتھی ہوئی تھی، لیکن اُن زمانوں کو بیتے ہوئے بہت زمانے ہو چکے تھے جب ہر درخت سرسبز ہوتا ہے، اُس کی داڑھی میں سیاہ ریکھائیں کم کم تھیں، سفید ہو چکی تھیں لیکن اُس میں سے نمودار ہونے والا اُس کا چہرہ سرخ و سفید اور ابھی تک دل کش تھا، مجھے محسوس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو کر زیادہ خوش شکل اور وجاہت بھرا ہو گیا ہے جو میں نہ ہوا تھا..میں پہلی نظر میں ہی اُس پر ایک مرتبہ پھر فدا ہو گیا، کیسا شاندار سردار تھا..

اُس کے پہلو میں اُس کی سردارنی رُوپی تھی اور وہ بھی آثار بتاتے تھے کہ کبھی رُوپ نگر کی رانی ہوا کرتی تھی لیکن..اُسے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی، اُس کے گھٹنے جواب دیتے جا رہے تھے..بمشکل چلتی وہ

ہمارے استقبال کے لئے چلی آتی تھی اور ایک سُنہری عینک میں مسکراتی چلی جاتی تھی..

اور اُن دونوں کے پیچھے دُم ہلاتا شیرا تھا..

''چوہدری جی..جی آیا نُوں..تُسی رانگی صاحب دے سب توُں پُرانے دوست ہو..آ جاؤ..لنگھ آ ؤ..''

رُوپی مُجھ سے مخاطب ہو کر فوری طور پر مُونا کے گلے لگ گئی ''ماشاءاللہ بہن جی..آپ تو چوہدری جی سے بھی زیادہ سمارٹ اور سوہنے ہو..انشاءاللہ آپ ہمارے گھر میں سُکھی رہو گے..لنگھ آ ؤ..اوئے شیرا پراں دفع ہو..''

کہ شیرا منڈلاتا پھرتا تھا، اجنبی لوگوں کی آمد پر شک شبہے میں مبتلا اُنہیں سونگھ کر اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ یہ قابلِ اعتماد لوگ ہیں یا نہیں..

''پراں دفع ہو پُتر..''رُوپی نے ایک مرتبہ پھر اُسے ڈانٹا..

بڑھاپے کی آخری دنوں کی تنہائی شائد آخری تنہائی کے لئے ایک ریہرسل ہوتی ہے.. بال بچے بیاہے جا چکے اپنے اپنے بچّوں والے ہو چکے اور وہ اُن کے مستقبل فکرمند اور مصروف..میری ساس صاحبہ کی ماشاءاللہ نو اولادیں تھیں اور تب سب بیٹے بیٹیاں اپنے گھروں میں آباد اور خوش وخرم اور پھر بھی وہ اپنے کمرے میں تنہا..میرے ابا جی، تین بیٹے اور تین بیٹیاں، صحت مند، شادی شدہ، اپنے باپ کے مطیع اور اُن سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے اور اس کے باوجود آخری عُمر میں ابا جی تنہا..اور اب میں اور مُونا..تنہا..

سکھدیپ اور رُوپی بھی عُمر کے اس حصّے میں، تنہا..

؎ میری مانند خود نگر تنہا..یہ صراحی میں پھول نرگس کا

سُکھدیپ نے آگے بڑھ کر نہ تو مُجھے گلے لگایا اور نہ ہی کسی بے جا اُلفت کا اظہار کیا، میرے سامنے کھڑا، جھکا ہوا، سفید داڑھی میں سے پھُوٹتی مسکراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتا رہا..اور جب شیرا متجسّس ہو کر مُجھے سونگھنے کے لئے میرے قریب ہونے لگا تو اُس نے کہا''شیرا، یہ چوہدری ہے..میرا سب سے پُرانا یار، میری جوانی کی شبنم..پراں دفع ہو..''

ہاں، یہ وہی ہمدم دیرینہ تھا جس سے ملاقات مسیحا اور خضر سے بہتر تھی..لونگ رُوم میں جہاں سُکھدیپ ایک بڑی ٹیلی ویژن سکرین کے سامنے، شیرا کی رفاقت میں دنیا بھر میں منعقد ہونے والے گولف کے مقابلے مگن ہو کر دیکھتا تھا کہ وہ خود بھی گولف کا ایک شیدائی رہا تھا، برابر میں کچن تھا جہاں رُوپی رات کا کھانا تیار کرتی تھی اور سامنے ایک شیشے کی بلند آرپار کھڑکی تھی جس میں سے اُس گھر کے لان میں جتنے بھی گُل بُوٹے، بیلیں اور درخت تھے اور ان میں ایک جاپانی چنار بھی تھا وہ سب کے سب لونگ رُوم میں چلے آتے تھے وہاں ایک بُک شیلف میں میرے اولین سفرناموں کا مجموعہ سجا تھا، جو میں نے کسی دوست کے

ہاتھوں اُسے آسٹریلیا بھیجا تھا..

''سکھدیپ کیا تم جانتے ہو کہ میں اردو میں تمہارے بارے میں کیا کیا لکھتا رہتا ہوں..''

''آہو..'' وہ اپنی سفید داڑھی میں مسکرایا اور مجھے محسوس ہوا کہ اُس کی مسکراہٹ میں ملال اب کچھ کم ہے..''آہو..جب کوئی اردو جاننے والا دوست میرے گھر آتا ہے تو میں اُسے کہتا ہوں کہ ذرا یہ پڑھ کے مجھے بتا کہ چوہدری نے میرے بارے میں کیا لکھا ہے..اوئے چوہدری، ویسے تُو ڈنڈی مار جاتا ہے..میں اگر لکھاری ہوتا ناں تو پھر تیرے پول کھولتا..''

میں جب کبھی اُس کی جانب دیکھتا، وہ مجھے دیکھتا ہوتا اور پھر نہائت معصومیت سے آنکھیں جُھکا کر مسکرانے لگتا..

ہمارے لئے ایک وسیع اور سُتھری خواب گاہ جس کے آرام دہ بستر پر ایسی چادریں بچھی تھیں جن میں کنوار پن کی مہک تھی اور ایسے نرم ہوتے تھے جن میں شائد آسٹریلوی پرندوں کے پَر تھے، ہمارے لئے مخصوص تھی..بائیں جانب کی کھڑکی میں سے نادیدہ شجروں اور جھاڑیوں کی مہک اندر سرائت کرتی تھی اور کبھی کبھار کوئی پنچھی کُوکنے لگتا تھا، ہم آسٹریلیا میں آمد کے بعد پہلی بار اُس دوپہر اطمینان کی نیند میں اترے، مدہوش ہوئے، دیر تک خوابیدہ رہے جیسے اپنے گھر میں سوتے ہوں..

وہ جو دو چار دن ہم نے سکھدیپ اور رُوپا کے گھر میں بسر کئے، کیسے پُرسکون اور ذہن کو آسودگی دینے والے دن تھے..

نہ میں نے سکھدیپ سے اُس کے جھکاؤ اور زوال کے آثار کی بابت کچھ پوچھا اور نہ ہی اُس نے کچھ تذکرہ کیا لیکن رُوپی کا کہنا تھا کہ رانگی جی کو دارو سے کچھ پرابلم ہوگئی تھی، اُس کے دماغ کی کوئی شریان ایسی تھی جو دھڑکنے میں وقفے دیتی تھی اور ڈاکٹر نے اُسے مکمل اجتناب کا مشورہ دیا تھا البتہ محدود مقدار میں وائن پینے پر پابندی نہ تھی..لیکن ایک پابندی تھی، وائن کی صرف ایک بوتل خریدیئے، پورا کریٹ نہیں، اور اُسے پینے کے بعد پھر سے مارکیٹ جایئے اور پھر صرف ایک بوتل حاصل کر کے گھر لایئے..

چنانچہ اکثر وہ ٹیلی ویژن سکرین پر دکھائے جانے والے کسی گولف ٹورنامنٹ کو دیکھتے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھتا اور کہتا''چوہدری آجا..''

اور میں جانتے ہوئے بھی کہتا''کہاں؟''

تو وہ سر جھٹک کر مونچھوں کو تاؤ دے کر مسکراتا''بس آجا..''

جیسے اُس نے کہا تھا، سینٹ آئیوز کے اُس وائن سٹور کی سیلز گرل اُسے دیکھ کر مسکرانے لگتی کہ یہ سردار جی وائن کی صرف ایک بوتل خریدنے کے لئے پھر سے اتنا طویل فاصلہ طے کر کے آ گئے ہیں..شام سے پہلے پھر سے مسکراتے ہوئے جُھکے ہوئے آ جائیں گے..

سکھدیپ کا کہنا تھا کہ اُس نے یہ گھر آج سے بتیس برس پیشتر خریدا تھا تو چھوٹا محسوس ہوتا تھا لیکن دن رات بچّوں اور اُن کے دوستوں کی رونقیں ہوا کرتی تھیں، اب بیٹی چندی گڑھ میں بیاہی جا چکی تھی اور اُس کی شادی پر سکھدیپ نے مُجھے اور میمونہ کو شمولیت کا خصوصی سندیسہ بھیجا تھا لیکن ویزے کا حصول ممکن نہ ہو سکا اور ہم شرکت نہ کر سکے..دونوں بیٹے بھی اپنے اپنے گھروں والے ہو چکے تھے، ایک بیٹا وِکرم تو بین الاقوامی کاروباری معاملات میں اُلجھا ہوا تھا اور دوسرا یہیں اسی علاقے سینٹ آئیوز میں مقیم تھا لیکن مصروفیت ایسی کہ کم ہی ادھر آتا تھا، تب یہ گھر چھوٹا محسوس ہوتا تھا اور اب یہ اتنا بڑا ہو گیا تھا جتنی کہ ان عمر رسیدہ میاں بیوی کی تنہائی!

اُن کے دیدہ زیب اور پُر کیف گھر کا باغ اجڑتا ہوا لگتا تھا، جھاڑیاں، پودے اور گھاس ضرورت سے زیادہ بڑھ چکے تھے، اس کے ایک کونے میں جاپانی طرز ترتیب کا ایک فراموش شدہ تالاب تھا جس کے کناروں پر لگائے گئے خصوصی چھوٹے قد کے پُھول دینے والے شجر غفلت کا شکار ہو چکے تھے..ہمارے ہاں ''برڈ آف پیراڈائز'' کا بُوٹا بمشکل پرورش پاتا ہے اور کبھی کبھار جب اُس پر ایک پُھول آ جائے تو دُھوم پڑ جاتی ہے کہ آؤ اُس پُھول کو دیکھیں جس کی شکل ایک رنگین پرندے سے مشابہ ہے..لیکن آسٹریلیا کے موسم اس بُوٹے کو اتنے مرغوب ہیں کہ وہ یہاں بے پناہ خوش رہتا ہے اور پُھولوں کے انبار لگا دیتا ہے..نہ صرف گھروں میں بلکہ شاہراہوں کے کنارے، پارکوں میں، لگتا ہے کہ دنیا بھر کے برڈز آف پیراڈائز کے غول اتر آئے ہیں..

سکھدیپ کے گھر میں بھی یہ پرندے بہ کثرت کھلتے تھے لیکن ایسے پرندوں کی موجودگی جو بے شک جنت کے ہوں، تنہائی کا مداوا نہیں ہو سکتی..اور اُن کا واحد رفیق شیرا جسے وہ اپنا ''پُتر'' کہتے تھے، وہ بے چارہ بھی شُوگر کا مریض تھا، روزانہ دو گولیاں اُس کی شوگر کو کنٹرول کرنے کے لئے اُس کے راتب میں ڈال دی جاتی تھیں..سچّی بات ہے مُجھے آج تک علم نہ تھا کہ کتّوں کو بھی شُوگر ہو جاتی ہے اگرچہ وہ میٹھے کے شوقین نہیں ہوتے چاکلیٹ اور مٹھائیاں کھانے سے بھی شائد پرہیز کرتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کُتّے کو کھیر ہضم نہیں ہوتی تو پھر..شیرا شائد ایک سکھ کُتا تھا اس لئے اُسے شوگر ہو گئی تھی کہ عین ممکن ہے کہ وہ کڑاہ پرشاد یعنی حلوہ رغبت

سے کھاتا ہو..

رُوپی ایک عبادت گذار عورت تھی..

ہمارے بیڈروم کے سامنے جو کمرہ تھا اُس میں گرنتھ صاحب کا ایک نسخہ ہاروں سے آراستہ سجا تھا..

رُوپی نہائت باقاعدگی سے ہاتھ جوڑ کر اُس کے سامنے سیس نواتی، جُھکتی اور اُسے پنکھا جھلتی کہ سکھوں کے عقیدے کے مطابق گرنتھ صاحب ایک مقدس صحیفے کے طور پر محض ایک کتاب نہیں، ایک زندہ وجود ہے..جس کی آسائش کا خیال رکھا جاتا ہے، گرمیوں میں جہاں گرنتھ صاحب ہو وہاں ایئر کنڈیشنر اُسے ٹھنڈک پہنچاتے ہیں اور سردیوں میں ہیٹر کا انتظام ہوتا ہے..

سکھ مذہب میں بُت پرستی حرام ہے، وہ شائد دنیا کے سب سے بڑے توحید پرست ہیں، اُن کی عبادت گاہوں میں کوئی تصویر نہیں ہوتی، صرف گرنتھ صاحب کے نسخے ہوتے ہیں جن کے آگے وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں..

میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ جب مجھے گورودوارہ جنم استھان، بابا گورونانک کی جائے پیدائش پر مدعو کیا گیا تو ایک راگی نے بابا فرید کا کلام ہارمونیم پر پیش کیا..اُٹھ فرید اُستیا صُبح نماز گذار..اور پھر جیسے ہمارے ہاں مزاروں پر آپ کے اعزاز میں ایک سبز چادر پیش کی جاتی ہے ایسے وہاں مجھے ایک ''شلوکا'' اوڑھایا گیا جو میں نے کسی دوست کے ہاں سکھدیپ کو آسٹریلیا روانہ کر دیا..

رُوپی کے عبادت کے کمرے میں گرنتھ صاحب کے علاوہ وہ شلوکا بھی محفوظ تھا..

رُوپی کو البتہ شکائت تھی کہ رانگی جی گرنتھ صاحب کا پاٹ باقاعدگی سے نہیں کرتے..

''چوہدری جی..آپ اسے سمجھاؤ، اخیر آنے والا ہے تو یہ واہگرو کو کیا جواب دیں گے..''

میں مسکراتا رہتا کہ سکھدیپ واہگرو کو وہی جواب دے گا جو میں اپنے رب کو دوں گا کہ ہم دونوں کا کیس ملتا جلتا تھا..

سکھدیپ بھی موضوع بدلنے کی خاطر شیرا کو اشارہ کرتا تو وہ ایک کُشن مُنہ میں دبوچ کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا..

○○○○○

''سُکھدیپ کے گھر کی اداسی اور میری محبت میں مبتلا منتظر لوگ''

اُس شام جب میں ذہنی طور پر کُچھ حساب کتاب کر رہا تھا، اپنی کتابوں کی ورق گردانی کرتا تھا، کسی حد تک فکر مند اور بے چین سا تھا کہ جاوید نظر نے مجھے اگر خصوصی طور پر آسٹریلیا بُلایا تھا، میرے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا تو میں نے اُس شام کی گفتگو کو کیسے ترتیب دینا تھا، کیا پڑھنا تھا، کیا کہنا تھا تا کہ وہ اور محفل میں شرکت کرنے والے پاکستانی میری آمد پر مایوس نہ ہوں کہ اسے کیوں بُلا لیا ہے..

شاعروں کو اور خاص طور پر مزاحیہ شکلوں کے مزاحیہ شاعروں کو بہت سہولت ہوتی ہے..اُن کی جیب میں تیر بہدف نُسخے ہوتے ہیں جو ورجنوں مشاعروں میں آزمائے جا چکے ہوتے ہیں اور خلق خدا کو لوٹ پوٹ کر چکے ہوتے ہیں تو اُنہیں کُچھ فکر مندی نہیں ہوتی، اُنہیں سوچنا نہیں پڑتا..ایک نثر نگار کی حیثیت میں مجھے سوچنا پڑتا تھا کہ اپنی ساٹھ کتابوں میں سے کون سے اوراق محفل میں پیش کروں..کہ عزت رہ جائے..بس میں اسی مخمصے میں تھا جب شیرا حسب عادت ایک کُشن مُنہ میں دبائے میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور دُم ہلانے لگا..کھڑکی میں سے ڈھلتے سورج کی کرنیں اُس کی بھوری جلد پر اُترتی تھیں..اُس کے تھرکتے بھورے بدن کو زرد کرتی تھیں..

میں اس روٹین سے واقف ہو چکا تھا کہ اگر شیرا ایک کونے میں اونگھتے ہوئے یکدم بیدار ہو کر صوفے کے ایک کُشن کو مُنہ میں دبا کر آپ کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، نہائت التجائی آنکھوں سے آپ کو تکتا جاتا ہے تو وہ اپنے پسندیدہ بسکٹ کا طلب گار ہے اور بسکٹ ملنے پر وہ اُس کُشن کو واپس صوفے پر رکھ کر بسکٹ سے لطف اندوز ہونے لگتا تھا لیکن آج شب بسکٹ کی پیشکش کے باوجود وہ کُشن دانتوں میں دبائے فریادی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا..

''سُکھدیپ..اب یہ کیا چاہتا ہے؟''

سُکھدیپ نے اُس دن کی آخری وائن کی بوتل کو ذرا جھکا کر گلاس میں انڈیلا، ایک گھونٹ بھرا اور

میری جانب دیکھا..اور اُس لمحے مُجھے محسوس ہوا کہ سکھدیپ اور شیرا کی آنکھوں میں ایک جیسی اداسی اور التجا تھی..اُس نے میرے قیام کے دوران کبھی بھی بے جا اُلفت کا اظہار نہ کیا، مُجھ سے دوستی کا مظاہرہ نہ کیا، نہ شکر گزار ہوا کہ میں آیا ہوں اور نہ ہی کسی گہری محبت کا برتاؤ کیا..البتہ کبھی کبھار میں اُس کی جانب دیکھتا تو اُس کی آنکھوں میں ایک تشکر آمیز محبت بھری، میرے لئے محبت بھری اداسی ہوتی اور وہ مُجھے متوجہ پا کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگتا..

''اب یہ کیا چاہتا ہے سکھدیپ؟''

''اسے محسوس ہو گیا ہے کہ تم گھر سے باہر جا رہے ہو..اور یہ نہیں چاہتا کہ تم جاؤ..اس لئے وہ بسکٹ کی جانب دھیان نہیں کر رہا..ایک کتا اور وہ بھی ڈوبرمین، جان جاتا ہے کہ یہ شخص بن سنور کے، کسی کا منتظر ہے، خوشبو لگا رکھی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص مُجھے چھوڑ کر جا رہا ہے، اور وہ نہیں چاہتا..''

''اسے سمجھاؤ کہ میں نے جانا ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ واپس آ جاؤں گا..''

سکھدیپ نے نہائت سنجیدگی سے شیرا کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے اور پنجابی میں شروع کر دیئے ''اوئے شیرا..یہ میرا یار ہے چوہدری..پُوری دنیا میں میرا اور کوئی اتنا پُرانا یار نہیں، یہ واپس آ جائے گا..''

شیرا بمشکل رضامند ہوا..کُشن سے جُدا ہو کر ایک ناراض حالت میں ٹیلی ویژن کے قریب جا بیٹھا..

سکھدیپ بار بار معذرت کرتا تھا کہ چوہدری میرا بہت جی چاہتا ہے کہ سڈنی کے لوگ جو تمہاری آؤ بھگت کر رہے ہیں میں اُس میں شامل ہو جاؤں لیکن کیا کروں..میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا، جُثے میں درد چھڑ جاتے ہیں، بیٹھ نہیں سکتا تو معاف کر دینا..'' اور پھر بچوں کی مانند کھلکھلا کر ہنسنے لگتا'' تیرا کیا پتہ تُو سٹیج پر بیٹھ کر پُرانے قصے چھیڑ دے اور میری طرف اشارہ کر کے کہے کہ..یہی ہے وہ سردار جو مُجھے اپنی سپورٹس کار پر تہران سے کیسپئن سمندر کے کناروں پر ایک رات لے گیا تھا اور راستے میں بھیڑیوں کی سلگتی روشن آنکھیں تھیں...دریائے خراج کے کنارے ایک ریستوران کے تالاب میں سے مچھلیاں پکڑتا تھا اور حافظ کے اشعار پر ایک ایرانی خاتون کے گرد بھنگڑا ڈالتا تھا، تیرا کیا پتہ..نہ، میں نہیں جا سکتا..''

میری شدید خواہش تھی کہ وہ آج شب کی تقریب میں موجود ہو لیکن میں نے اُسے مجبور نہ کیا..کہ میں جانتا تھا کہ اُس کی بھی یہی خواہش شدید ہے لیکن وہ بیماری اور بڑھاپے کے ہاتھوں مجبور ہے..

باہر پورچ کے پتھریلے راستے پر کسی کار کے ٹائر گھسٹتے ہوئے رُکے اور انجن خاموش ہو گیا..

جاوید نظر کار روانہ کر دہ ایک نوجوان، شکل، لباس اور عینک سے ایک جیٹ پائلٹ لگتا، میرا منتظر تھا..

شیرا ایک لمحے کے لئے چوکنا ہوا، کان کھڑے کر کے اٹھا اور پھر بیٹھ گیا..اپنی تھوتھنی دونوں ٹانگوں

کے درمیان رکھ کر ناراض نظروں سے مجھے دیکھنے لگا..

سینٹ آئیوز پر ہجوم کرتے درختوں کے گھنے پن کے اندر حرکت کرتی ایک کار مجھے اور میمونہ کو اُس قدیم ٹاؤن ہال کی جانب لئے جا رہی تھی جہاں کوچۂ ثقافت والوں کا آسٹریلوی بازار سجنا تھا، مجھے کچھ باتیں من کی اور کچھ فن کی کہنی تھیں.. میرے اندر فکرمندی بے چین کروٹیں بدلتی تھی..

کیا میں وہاں، میری محبت میں مبتلا جو لوگ آئیں گے کیا میں اُن کی توقعات پر پورا اتر سکوں گا..

بے شک میرے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی، میں یورپ، امریکہ، کینیڈا، روس وغیرہ بھی آتا جاتا رہتا تھا، ایسی بے شمار تقریبات میں مہمان اعزازی رہا تھا، اور کبھی ٹسکی تو نہ ہوئی تھی، پر نصیب کا کیا پتہ کہ آج ہو جائے تو میرے اندر ایک فکرمندی کروٹیں بدلتی تھی..

ooooo

''سڈنی کی تاریخ میں سب سے پرہجوم ادبی تقریب.. چہرے فروزاں، آنکھیں آبدیدہ اور ایک زہریلا مکڑا''

وہ ایک پوشیدہ سا سڈنی کی قدیم عمارتوں میں شمار کئے جانے والا کولونیل طرز تعمیر کا ٹاؤن ہال تھا جو باہر سے نیم تاریکی میں ظاہر ہوتا کچھ پُراسرار سا لگتا تھا، پُرانی رُوحوں کے سالانہ اجتماع کے لئے زیادہ موزوں لگتا تھا.. اس کے اندرون میں ایک کلیسا ایسی خاموش متانت تھی.. چھت بہت بلندی پر سیاہ شہتیروں کے سہارے قائم تھی اور ہال میں قطار اندر قطار کرسیاں بیکاری کا شکار تھیں، صرف چند لوگ تھے، کچھ اپنے پورے خاندان سمیت جو چھت کو تکتے تکتے جمائیاں لیتے، میرے منتظر تھے..

میرا دل کچھ بے دھڑک سا ہونے لگا، حالات اچھے نہ تھے، آخر تیس ڈالر کا ٹکٹ خرید کر بے شک اس میں ڈنر شامل ہو صرف میری کہولت زدہ شکل دیکھنے اور میری تحریریں سننے یا مجھ سے سوال جواب کرنے کون آئے گا..

اور جاوید نظر اپنی ریش سنوارتے اور آج تو اُن کی شلوار ٹخنوں سے اوپر گھٹنوں کی قربت میں ہونے کو تھی، ہنستے کھلکھلاتے انتظامات میں مشغول اڑتے پھرتے تھے.. اور جب میں نے سامعین کی قلت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تو کہنے لگے'' یہ لوگ تو آپ کے شوق میں قبل از وقت آ گئے ہیں.. میرے اللہ نے چاہا تو یہ ہال آپ کے چاہنے والوں سے لبریز ہو جائے گا.. آپ خاطر جمع رکھیں..''

میرے پاس خاطر تھی ہی نہیں جو جمع رکھتا، بس ایک تشویش چہرے کے ساتھ کبھی یہاں بیٹھتا کبھی وہاں جا بیٹھتا، کبھی اس سے بات کرتا کبھی اُس سے بات کرتا..

سرِ کوئے ناشنایاں ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

تقریب کے باقاعدہ آغاز سے پیشتر مجھے سٹیج کے دبیز پردوں کی اوٹ میں روپوش کر دیا گیا تا کہ ایک ڈرامائی داخلے سے یکدم حاضرین کو ایک صدمے کی کیفیت سے دوچار کیا جائے کہ ہائیں یہ ہیں تارڑ صاحب.. سٹیج پر کچھ کارروائی جاری تھی اور میں نے یہ جاننے کے لئے کہ پردے کے پیچھے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عظمیٰ گیلانی نہائت برق گرانے والی زرق برق ساڑھی میں ملبوس کسی حد تک اپنی گمشدہ جوانی کے زمانوں کی جھلکیاں جھلکاتی مسکراتی غالباً حاضرین سے میرا تعارف کروا رہی تھیں.. غالباً اس لئے کہ میں اللہ کے فضل سے بائیں کان سے یکسر فارغ ہو چکا ہوں، کچھ دیگر اعضاء کی مانند میرا بایاں کان بھی صرف نمائشی ہے، البتہ دائیں کان سے کچھ نہ کچھ سنائی دے جاتا ہے، مثلاً کوئی میری توصیف کرے تو صاف سنائی دینے لگتا ہے، اگر خاتون پیاری سی ہو تو وہ جو کہے سب سنائی دیتا ہے بلکہ کان میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں، البتہ اگر کوئی ناہنجار یہ کہے کہ تارڑ صاحب آپ ایک بوگس رائٹر ہیں تو پھر کچھ سنائی نہیں دیتا..

چنانچہ میں اپنا کسی حد تک کارآمد کان اُدھر لگائے سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں، بہرطور جب عظمیٰ نے ابرو کے اشارے سے ہاتھ ایک ڈرامائی انداز میں لہرا کر کہا.. جو بھی کہا میں فی الفور سٹیج پر داخل ہو گیا، آنکھیں روشنیوں کی عادی ہوئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہال بقول جاوید لبریز ہو چکا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص جیب میں سے ایک تل نکال کر اُسے دھرنا چاہے تو اُس کی بھی گنجائش نہ تھی، کچھ لوگ سٹیج کے آگے دھرنا مارے بیٹھے تھے.. اور وہ سب میرے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے اور اپنی مسرت کے اظہار کے طور پر تادیر تالیاں بجا کر مجھے خوش آمدید کہا اور مجھے یہ توقع تو نہ تھی..

یہ زندگی کے نایاب لمحوں میں سے ایک تھا جب اس نوعیت کی اُلفت کا اظہار آپ کو گنگ اور بے یقین کر دیتا ہے.. ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے اور میں تو اُن میں بھی شامل نہیں ہوں چہ جائکہ میرا اندازِ بیاں اور ہو.. آپ کی بجھتی بوڑھی آنکھوں میں اگر تشکر کی نمی آ جاتی ہے کہ اے رب کعبہ تو چاہتا تو مجھے ذلت دے سکتا تھا اور اب یہ تُو نے چاہا تو مجھے عزت ملی.. شکریہ!

میرے بعد انجم ایاز ایک پیلاہٹ میں جلوہ گر ہوئے کہ اُنہوں نے اپنے تئیں ایک آرٹسٹک پیلا کُرتہ زیب بدن کر رکھا تھا.. اُنہوں نے کچھ گفتگو کی اور پھر سٹیج پر ایزل قائم کر کے کینوس پر ایک تصویر بنانے میں مگن ہو گئے جس میں صادقین انداز کی پرچھائیاں تھیں..

میرے جیسے لوگ جو میڈیا اور ادب سے یکساں طور پر منسلک ہوتے ہیں، اُن کا ایک یونانی طرز کا المیہ ہوتا ہے.. میڈیا کے لوگ چاہے وہ اظہار نہ کریں یہی سمجھتے ہیں کہ یہ شخص تو ایک ادیب ہے اور اُدھر ادیب برادری دھتکارتی ہے کہ صاحب پرے پرے آپ تو اداکار اور میزبان وغیرہ ہیں، ادب سے آپ کا کیا

واسطہ.. مُجھے یاد ہے جب میں نے اپنی پہلی کتاب ٹیلی ویژن کے محمد نثار حسین کو پیش کی تو اُس نے ناگواری سے کہا'' تارڑ تم ایک اداکار ہو..ادب تمہارا شعبہ نہیں..'' اور اُدھر ممتاز مفتی مُجھ سے ناراض پھرتے تھے کہ تم میڈیا میں کیا کر رہے ہو، اس کی شہرت تمہیں لے ڈوبے گی تم ایک بڑے ادیب ہو، وہاں کیا کر رہے ہو..بہر طور میں دیکھ سکتا تھا کہ عظمیٰ قطعی طور پر بے خبر تھی کہ میں پچھلے پچیس برس سے پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والا نثر نگار ہوں تو وہ صرف میری اداکاری اور ڈرامہ نگاری کے حوالے دے رہی تھی..وہ مُجھے نہیں جانتی تھی..

اس دوران عظمیٰ نے اپنی کھنکتی گہری جنسی آواز میں ایک کہانی ڈرامائی انداز میں پڑھی، اگرچہ وہ کسی حد تک زنگ آلود ہو چکی تھی لیکن اُس شب کُچھ زنگ زائل ہوا..کہانی کی طوالت نے بے شک تاثیر کو قدرے مجروح کیا..

اُدھر کونے میں انجم ایاز اپنے کینوس پر رنگ بکھیر رہے تھے اور ایک تصویر نمایاں ہو رہی تھی..

اس مقام پر میں نے مناسب جانا کہ عظمیٰ کو آزمائش میں ڈالنے کی بجائے اپنی تقریب کی باگ ڈور خود ہی سنبھال لوں اور براہ راست سامعین سے رابطہ اختیار کر لوں..میں نے کُچھ باتیں من کی اور کُچھ فن کی کیں..سامعین درجنوں سوال سنبھالے ہوئے تھے، ایک خاتون نے اعتراض کیا کہ پچھلے چند برسوں سے آپ کے سفرناموں میں آپ کی بیگم مُونا ہیروئن ہوتی ہے تو ایسا کیوں ہے..تو میں نے اس سوال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا'' بی بی پہلے اعتراض ہوتا تھا کہ تارڑ کے سفرنامے میں لڑکیاں بہت ہوتی ہیں، اور وہ تھیں تبھی تو ہوتی تھیں اور اب یہ اعتراض ہے کہ میری بیگم کیوں ہوتی ہے تو اگر میں آخری عُمر میں جا کر اپنی بیگم کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں تو اس پر بھی اعتراض ہے..میں اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ ایسی محفلوں میں آپ اپنے سفرناموں یا ناولوں کے ایسے حصے نہیں پڑھ سکتے جو آپ کی تخلیقی کاوش کی معراج ہوتے ہیں، اُنہیں مزاحیہ شاعری اور لطیفے باز کالم نگاروں کی عادت ہوتی ہے اور یقین کیجئے لوگوں کو محظوظ کرنا میرے جیسے شخص کے لئے کُچھ اتنا مُشکل نہیں ہوتا کہ بہت سے نقاد طنز و مزاح کے حوالے سے بھی مُجھے اردو کے گنے چنے ادیبوں میں شمار کرتے ہیں اور ان میں مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان اور شفیق الرحمٰن بھی شامل ہیں چنانچہ میں نے اُس تقریب میں گدھوں کے حوالے سے ایک کالم پڑھا..کیسے وہ اپنے اعضاء سے شاعری کرتے ہیں اس کا ذکر کیا..اور تقریب قہقہہ بار ہو گئی..

ازاں بعد کُچھ سوال جواب ہوئے اور جتنے بھی سوال ہوئے وہ سب میرے ادب سے آشنا اور ذوق جمال رکھنے والے اُلفت بھرے لوگوں سے آئے..تب میں نے سوچا کہ ان لوگوں کو اپنے اُس رُخ سے متعارف کرواؤں جس رُخ پر سبز گنبد ثبت ہے، قصویٰ اونٹنی کا وہ سوار ہے جو اپنی جُوتیاں خود گانٹھتا تھا اور ہر گانٹھ

میں یہ میرا دل ہے جو بندھا ہوا ہے.. میں نے ''غارِ حرا میں ایک رات'' کا ایک اقتباس پڑھا..اس کتاب کی جب میں نے آخری سطریں تحریر کیں تو میں ایک ایسی ہیجان آمیز کیفیت میں تھا کہ انتساب میں لکھ ڈالنا چاہتا تھا کہ کوئی اعتراض نہ کرے.. جو میں نے لکھا ہے اُس پر شک نہ کرے کہ جو میں نے لکھا ہے اُس کی اجازت مجھے قصویٰ کے سوار نے ذاتی طور پر عنائت کی ہے..اگرچہ میں نے یہ نہ لکھا..کہ شائد یہ تکبّر کے زمرے میں آتا ہو..

حیرت انگیز طور پر سڈنی کی اُس شب میں، اُس ٹاؤن ہال میں جب میں نے وہ اقتباس پڑھا تو بہت سی آنکھیں نم ہوگئیں، بلکہ میرا گلا رُندھ گیا اور میں یکدم چُپ ہوگیا..

تقریب کے آخر میں ایک خوش شکل بااعتماد خاتون یکدم نمودار ہوئیں اور سٹیج کے نیچے کھڑے ہوکر مجھ سے مخاطب ہوکر بلند آواز میں کہنے لگیں ''میں احتجاج کرنے آئی ہوں..''

یکدم سنّاٹا چھا گیا..

''میں تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اس تقریب میں شامل ہوئی ہوں..میں ایک ڈاکٹر ہوں..آپ نے ''نکلے تری تلاش میں'' لکھی تو ہم بھی جانے کس کی تلاش میں نکل گئے..پھر خانہ بدوش ہوگئے.. نانگا پربت..کے ٹُو اور سنولیک کے خوابوں میں چلے گئے..آپ نے ہمیں دربدر کردیا اور اگر آج میں آسٹریلیا میں ہوں تو یہ آپ کی تحریروں کا فتور ہے..اور آپ سے شکائت یہ ہے کہ ہمیں بے گھر کر کے آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں، اپنے لاہور میں بیٹھے ہیں..آپ نے ہمیں ہی خراب کرنا تھا، اپنے وطن سے نکالنا تھا..آپ ہمیں اچھے نہیں لگتے..''

وہ ڈاکٹر صاحبہ میری تحریروں کی حافظ تھیں، شیدائی تھیں، اُن کا حق بنتا تھا کہ وہ شکائت کریں، مجھے بُرا بھلا کہتیں..

تقریب کے اختتام پر آسٹریلیا بھر سے آئے ہوئے، دور کے شہروں سے صرف مجھ سے ملاقات کی خاطر سفر کر کے آئے ہوئے لوگ میرے گرد جمع ہوگئے..اور وہ مجھے اپنے اپنے شہروں میں مدعو کرنا چاہتے تھے، اگر میں وہ سب دعوتیں قبول کر لیتا تو اگلا ایک برس آسٹریلیا میں ہی بسر ہوتا..

جاوید نظر آج سڈنی کا سب سے مطمئن اور پُرمسرت شخص تھا کہ بقول اُس کے یہ اس شہر کی تاریخ میں سب سے پُرہجوم ادبی تقریب تھی..

متعدد لوگ میری تصویریں اتار رہے تھے اور یکدم مجھے ایک جھٹکا سا لگا کہ اُن میں ایک شناسا اور عزیز چہرہ بھی تھا..

اور وہ سلمان تھا..

اور وہ بھالو میرے مداحین میں شامل نہائت سنجیدگی سے اپنے سائز کے بھاری بھرکم کیمرے سے میری تصویریں اُتار رہا تھا اور اُس کے چہرے پر میرے لئے کوئی خصوصی شناسائی نہ تھی جیسے جانتا ہی نہ ہو، پہچانتا ہی نہ ہو..اُس کی غیر متوقع موجودگی نے مُجھے خوشی سے بھر دیا..میں نے اُسے بُری طرح گھورا تو ہنس کر کہنے لگا''سَر جی..میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا کہ روز روز آپ کو ایسے آسٹریلین چاہنے والے کہاں ملتے ہیں..''

اور ہاں میں فراموش کر گیا کہ محفل کے اختتام تک انجم نیاز اپنی تصویر مکمل کر چکا تھا اور عظمٰی نے اُسے فوری طور پر ایک ہزار ڈالر میں نیلام کر ڈالا..میں کُچھ حسد میں مبتلا ہوا کہ ہم تو سال بھر کی مشقت اور بہت سی موم بتیاں جلا کر، پسینے بہا کر ایک کتاب لکھتے ہیں تو بھی اُس کی رائلٹی پچاس ہزار سے تجاوز نہیں کرتی اور یہ حضرت صرف ایک پیلا کُرتہ پہن کر کینوس پر کُچھ رنگ بکھیرتے ہیں اور لکھ پتی ہو جاتے ہیں البتہ ایک طمانیت تھی کہ تصویر تو صرف ایک بار فروخت ہوتی ہے جب کہ کتاب برسوں تک فروخت ہوتی ہی چلی جاتی ہے..

سلمان نے اصرار کیا کہ وہ مُجھے اور مُونا کو سکھدیپ کے ہاں چھوڑنے جائے گا..اور اُس نے ہرگز مُجھے اُس زہریلے مکڑے کے بارے میں نہیں بتایا جو اُس کی سیاہ لینڈ کروزر کی ونڈ شیلڈ پر پوری مکڑا شان و شوکت سے براجمان تھا..

''سَوری سَر..''سلمان نے معذرت کی اور فوراً گلو کمپارٹمنٹ میں موجود ایک سپرے برآمد کیا اور اُس مکڑے پر اُس سے زیادہ زہریلا چھڑکاؤ کر دیا..اور وہ غریب اوندھا ہو کر میری نشست کے فرش پر کہیں گر گیا..

''سلمان چیک کرو، کہیں یہ زندہ نہ ہو..''

''نہیں سر جی..آپ فکر نہ کریں، یہ سپرے ایسا ہے کہ کوبرا سانپ پر چھڑک دو تو وہ دو سیکنڈ میں ایک کینچوا ہو کر مر جائے..یہ تو پھر مکڑا ہے..''

مُونا بے حد خوفزدہ تھی..''مُجھے اس لینڈ روور میں نہیں بیٹھنا، مکڑا بے شک مر گیا ہو گا لیکن ہے تو یہیں کہیں..''

تب سلمان نے مُونا کی ڈھارس بندھانے کی خاطر مکڑے کی موجودگی کا جواز پیش کیا''بھابھی میرے گھر کے داخلے پر جب ہم نے اسے خریدا تو ایک بہت تناور درخت تھا جو خطرناک حد تک گھر پر جُھکا ہوا تھا اور عائشہ ہمہ وقت خوفزدہ رہتی تھی کہ یہ کسی بھی وقت ہم پر آن گرے گا..یہاں بندہ کاٹ دو تو سزا کم ہوتی ہے، درخت کاٹ دو تو عُمر قید ہو جاتی ہے چنانچہ میں نے ایک برس کی قانونی جدوجہد کے بعد یہ ثابت کیا کہ

میری بیوی اس درخت کے جھکاؤ کی وجہ سے ایک نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے، وہ راتوں کو سو نہیں سکتی کہ کہیں یہ درخت اُس پر اور بچوں پر گر نہ جائے..اس دوران میں نے ایک ماہر نفسیات کو بھی اپنے دفاع میں پیش کیا اور بالآخر مجُھے اس درخت کو کاٹ کر گرا دینے کی اجازت مل گئی..آج ہی میں نے اُس درخت کو گرایا ہے تو یہ مکڑا اُس کی شاخوں میں کہیں آباد تھا..درخت گرا تو یہ نیچے پارک شدہ لینڈ روور پر آ گرا اور رینگ کر اندر آ گیا.. بھابھی مر گیا ہے آپ بے خطر ہو جائیں..''

ہم بے خطر تو نہ ہوئے، مسلسل ایک بے چینی سی بدن پر رینگتی رہی..

○○○○○○

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

''واہگرو کی کرپا ہوگئی..جنت کے پرندے ہمارے بیڈروم میں''

ہم گئی شب سینٹ آئیوز پہنچے اور سلمان اپنے مُردہ مکڑے کے ہمراہ ہمیں جنت کے پرندے پھولوں کی شب میں چھوڑ کر واپس چلا گیا..

سکھدیپ ہر شب کی مانند ٹیلی ویژن پر کوئی بین الاقوامی گولف ٹورنامنٹ دیکھ رہا تھا..رُوپی بمشکل حرکت کرتی گھٹنوں کے درد سے عاجز آتی لونگ رُوم سے منسلک کچن میں کوئی خوراک تیار کر رہی تھی..اور شیرا ایک کونے میں رنجیدہ سا بیٹھا تھا، اُس نے ہمیں دیکھا تو فوری طور پر ایک کُشن دانتوں میں دبوچ کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا..

''سکھدیپ..یہ شیرا کیا چاہتا ہے؟''

''یہ تمہاری واپسی پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے..اسے ایک بسکٹ دو..''

رُوپی کچن سے باہر آ کر کہنے لگی''چوہدری جی، رانگی جی آج شب بہت اداس بیٹھے رہے ہیں، کہتے تھے اس بڑھاپے پر لاکھ لعنتیں..میں اپنے قدیمی یار کی محفل میں شریک نہیں ہو سکا..ویسے میں نے آپ کے لئے ایک خصوصی میٹھا تیار کیا ہے، آپ نے ایک''کولی''ضرور کھانی ہے..''

بے شک دنیا کی بے شمار اقوام میٹھے کی، چاکلیٹ کی، مٹھائیوں اور شیرینیوں کی شیدائی ہیں لیکن یہ صرف سکھ ہیں جو میٹھے کو مقدس جانتے ہیں..کڑاہ پرشاد یا حلوہ اُن کی عبادت میں شامل ہے..چنانچہ رُوپی کا تیار کردہ میٹھا ایسا تھا کہ میں نے ایک''کولی''نہیں، دو تین کولیاں کھایا کہ میٹھا ہمارے ہاں بھی تقریباً ایک مذہب ہے..گئے زمانوں کے پنجابی دیہات میں باراتیوں کی تواضع میٹھے چاولوں سے کی جاتی تھی اور پھر پُوچھا جاتا تھا کہ اب مُنہ کو نمکین کرنا ہے..میرے ابا جی جیسا کہ میں اکثر تذکرہ کرتا ہوں کہا کرتے تھے، اور وہ آخری عُمر میں بھی کلو بھر دیسی گھی سے نچڑتا حلوہ نوش کر جاتے تھے کہ یاد رکھو، حلوہ کھانے کے لیے بُھوک ضروری نہیں، یہ کسی بھی وقت کھایا جا سکتا ہے اور یہ ہمیشہ ہضم شدہ ہوتا ہے..

''چوہدری..تقریب کیسی رہی؟''اُس نے ذرا شرمندگی سے پُوچھا..

''اگر تم وہاں ہوتے تو وہ کڑاہ پرشاد ہو جاتی.. پر تم وہاں موجود تھے..''

''وَف..''شیرا نے جیسے میری ہاں میں ہاں ملائی..اگر چہ وہ ایک کم بھونکنے والا کتا تھا..

''اِک کولی اور کھالو چوہدری جی..''

اس گھر میں محبت اتنی تھی کہ مُجھے باقاعدہ احساس ہوا کہ لان میں کھلے جنت کے پرندے پُھول زندہ ہو کر اُس شب ہمارے بیڈرُوم میں داخل ہو کر اپنے پروں کی رنگینیوں سے ہمیں رنگتے تھے..

لیکن ہم دیر تک نہ سوئے..

ہمارے بستر کے سرہانے سکھدیپ کے والدین کی ایک بڑی تصویر آویزاں تھی، ایک پُروجاہت سردار اپنی داڑھی میں مسکراتا ہوا اور اُس کے پہلو میں اُس کی سادہ اور پُروقار بیوی..

ایک مرتبہ برسلز میں مُجھے ایک ایسے گھر میں سلایا گیا جس کے بیڈرُوم میں اُس کے پاکستانی مالک کی والدہ مُحترمہ کی متعدد مغنک اور عجیب سی تصویریں ہر در و دیوار پر آویزاں ہماری نگرانی کرتی تھیں، آنکھ کُھلتی تو والدہ کا سنجیدہ چہرہ ہمیں گھورتا ہوا دکھائی دیتا..لیکن یہاں سکھدیپ کے والدین کی رنگین تصویر نے ہمیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا بلکہ وہ تصویر پلنگ کے اوپر آویزاں نہ ہوتی تو شائد ہم اتنا ایٹ ہوم محسوس نہ کرتے..

اور وہ جو جنت کے پرندے اُس شب ہمارے بیڈ روم میں داخل ہو کر اپنی رنگینی سے ہمیں بھی رنگتے تھے..میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتے تھے، آج کی شب سڈنی میں تمہیں جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے یہ اُس کا خاص انعام ہے جس نے ہمیں رنگین کیا..وہ نہ کرتا تو ہم بلیک اینڈ وہائٹ ہوتے، اسی طور تم پر فضل ہوا، واہگرو کی کرپا ہو گئی ورنہ تم بھی بے رنگ اور بلیک اینڈ وہائٹ ہوتے..سر کو جھکائے رکھنا..

oooooo

''سکھ گھرانے میں تمبا کو نوشی..سکھدیپ اپنی اداسی سے باہر نہ آتا تھا''

میرے ابا جی بتایا کرتے تھے اور وہ مجھے دنیا بھر کے مذہبوں کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے تھے کہ سکھوں کے مذہب کی بنیاد چار ''ککے'' ہیں یعنی چار ''ک'' ہیں..کچھ، کڑا، کنگھی اور کرپان..کچھ یعنی کچھا، انڈرویئر، لوہے کا کڑا باہوں میں، کنگھی سر کے اور داڑھی کے بال سنوارنے کے لئے کہ سکھوں میں بدن کے کسی بھی حصے کے بال کاٹنا ممنوع ہے اور کرپان اپنی حفاظت کے لیے..اور تقسیم کے دنوں میں یہ کرپان مسلمانوں کی قاتل ثابت ہوئی اور اس کے سوا تمبا کو حرام تھا..سردار کے لئے دارو جائز اور تمبا کو حرام تھا..بے شک میں دن میں سات آٹھ سگرٹ ہی پھونکتا تھا لیکن ان کے بغیر زندگی بیکار لگتی تھی..میں نہ صرف اپنے گھر میں بلکہ نیویارک اور آرلینڈو میں اپنے بچوں کے گھر کے اندر سگرٹ پینے سے اجتناب کرتا تھا..پائیں باغ میں جا کر یا باہر کھلی فضا میں بالکونی پر کھڑے ہو کر سوٹے لگا لیتا تھا تو ایک سکھ گھرانے میں تیرا کیا ہوگا کالیے..بہر طور سکھدیپ نے میری علت کے احترام میں گھر کے برآمدے میں، مہاتما بدھ اور لکشمی دیوی کی سجاوٹی مورتیوں کے قریب سومنگ پول کے کنارے پر میرے لئے ایک خصوصی ''سموکنگ کارنر'' کا اہتمام کر رکھا تھا..البتہ ایش ٹرے مفقود تھی..کہ ایک سکھ گھرانے میں ایش ٹرے کا وجود ایسے ہی ہے جیسے کسی مولانا کے حجرے میں سکاچ وہسکی کی بوتل..معاف کیجیے گا یہ موازنہ بھی مناسب نہیں کہ ہمارے ہاں ایک مولانا وہسکی بھی تو ہوا کرتے تھے..مولانا آزاد کے بارے میں غیر مصدقہ سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں اور ان زمانوں میں بھی ایک مولانا ایسے ہیں جن کا تن وتوش نصف کائنات پر محیط ہے اور وہ بھی نقل کفر، کفر نہ باشد..اکثر ٹن پائے جاتے ہیں۔ میں باہر برآمدے میں بیٹھ کر سگرٹ پی رہا ہوتا تو شیرا متجسس ہو کر میرے پیچھے چلا آتا اور ایک سکھ کتا ہونے کے باوجود تھوتھنی اٹھا کر سگرٹ کے دھویں سے لطف اندوز ہونے لگتا..

ہم اکثر ترلوک سنگھ منڈیر کو یاد کرنے لگتے جو ہمارا مشترکہ دوست تھا..وہ ایک شرمیلا اور معصوم سا سکھ تھا جس کا خاندان ایک مدت سے جنوبی افریقہ میں مقیم تھا، وہ صرف سفید اور صوفیانہ پگڑی باندھتا..

''وہ مُسرا تھا تو سردار پر افریقہ کا تھا، شریف سا سردار تھا.. مجھے یاد ہے جب ہم ساؤتھ اینڈ آن سی میں دارو پینے کے لئے کسی شراب خانے جاتے تو وہ مُسرا باہر بیٹھ کر حساب کے سوال حل کرتا تھا، معاشیات کی کتابیں پڑھنے میں مگن ہو جاتا..بھلا وہ سردار کیا جو دارو نہ پیتا ہو..سردار کیا مُسلا ہو گیا ناں..پھر میں اُسے راہ راست پر لے آیا اور اُس نے دارو پینے کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیئے..تم آخری بار اُسے کب ملے تھے؟..ترلوک پچھلے پچاس برسوں سے ہر کرسمس پر مجھے ایک کارڈ بھیجتا تھا اور مجھے اپنی زندگی اور خاندان کے بارے میں تفصیل سے لکھتا تھا اور ہمیشہ کہتا تھا کہ تم نے انگلستان نہیں آنا تو اپنے بیٹوں کو ہی بھیج دو..وہ یہاں آ کر ذرا سوشلائزنگ کریں تو سلجوق اور سُمیر کہتے ''ابا..ہم بھی انگلستان جا کر کچھ سوشلائزنگ کرنا چاہتے ہیں، آپ نے تو بہت کی ہے..''

ترلوک کے ساتھ انگلستان کے زمانوں کے بعد لاہور میں ایک عجب ملاقات ہو گئی..ترلوک، ہاکی کا ایسا شیدائی کہ اگر اُس کا بس چلتا تو وہ اپنی بیگم کی بجائے اپنے بستر میں ایک ہاکی کو سُلا لیتا..لاہور میں اور یہ اچھے اور روشن زمانوں کے قصے ہیں ایک بین الاقوامی ہاکی ٹورنامنٹ منعقد ہوا اور ترلوک لاہور پہنچ گیا..مال روڈ پر واقع ہوٹل انٹرنیشنل میں مقیم ایک سویر ناشتہ کرتے ہوئے پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات دیکھ رہا ہے تو وہاں میں تھا..صُبح کی نشریات کی میزبانی کرتے ہوئے اُن آٹھ برسوں میں سے کوئی ایک دن تھا، کوئی ایک صُبح تھی جب ترلوک نے مجھے سکرین پر دیکھا اور غُل مچا دیا، غدر برپا کر دیا کہ یہ تو چوہدری ہے، میرا یار ہے..نہ تو رُوم ویٹر نے اور نہ ہی ہوٹل کے منیجر نے اعتبار کیا کہ سردار صاحب ابھی خمار میں ہیں ورنہ یہ تارڑ صاحب کو کیسے جان سکتے ہیں..

قصہ مختصر وہ اپنی بیگم گڈی کے ہمراہ میرے گھر پہنچ گیا..

ترلوک اب ایک مونا سکھ ہو چکا تھا، داڑھی صاف کروا کے، بال کٹوا کر وہ کیا ہی خوش شکل شخص برآمد ہو گیا تھا..

وہ زمانے جو ہم دونوں نے سکھدیپ کے ہاں بسر کئے، کہنے کو دو تین دن تھے لیکن ہمارے لئے وہ زمانے تھے کہ اُن میں گذرے ہوئے زمانے بھی شامل تھے..سہگل کی آوازیں، کیوں یاد آ رہے ہیں گذرے ہوئے زمانے بھی شامل تھے..ہم ایک دوسرے کی جانب دیکھتے تو ہمارے درمیان اداسی اور یادوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا..ہمارے درمیان بیشتر اوقات خاموشی رہی اگرچہ وہ ہماری آنکھوں میں بولتی تھی..ہم

نے اپنے ماضی کے مزاروں کو بار بار کھودنے سے گریز کیا..

ایک دوپہر سکھدیپ نے ہمیں اپنی سیاہ مرسیڈس میں بٹھایا اور سینٹ آئیوز کے ایک وسیع اور دل کش ریستوران میں لے گیا..

مُونا اور میں نے اپنے لئے آسٹریلوی مچھلی کی دم پخت قسم پسند کی، سکھدیپ بیف سٹیک کا شیدائی تھا لیکن رُوپی نے گوشت سے مکمل پرہیز کیا..

کھانا میز پر آیا تو رُوپی کہنے لگی ''چوہدری جی میں بھی بیف کھایا کرتی تھی پھر ایک روز خیال آیا کہ یہ جو گائے ہوتی ہے کتنی کارآمد ہوتی ہے..دودھ مکھن دیتی ہے..اس کا گوبر جلانے کے کام آتا ہے اور پنجاب میں مٹی میں ملا کر کچے گھروں کو لیپا جاتا ہے کہ جراثیم کُش ہوتا ہے، اس کا پیشاب زخموں کو مندمل کرتا ہے تو اُسے کھا جانا تو بڑے ظلم کی بات ہے..''

سکھدیپ جو آج کے دن کی وائن کی پہلی بوتل کے پیندے تک آ چکا تھا، اپنی اداسی سے باہر آ کر تہران کا سکھدیپ ہو گیا ''اوئے رُوپی تُو ذرا یہ بیف سٹیک تو چکھ کر دیکھ بھولے..گائے نے بالآخر مرنا ہوتا ہے تو دو چار دن پہلے مر گئی..اگر افادیت کی بات ہے تو تُو کبھی کبھار مٹن کھا لیتی ہے تو بے چاری بھیڑ یا بکری کا کیا قصور ہے..وہ بھی دودھ دیتی ہیں، اُن کی اون سے تیرے لئے سویٹر بنتے ہیں..اور یہ جو چوہدری اور مُونا بھابھی مچھلی کھا رہے ہیں تو یہ معصوم بھی تو سمندروں میں تیرتی سوہنی لگتی ہیں..کیوی آر بھی تو مچھلی کے انڈے ہوتے ہیں..گائے ہماری نہیں ہندوؤں کی ماتا ہے..ذرا یہ بیف سٹیک چکھ کر تو دیکھ..''

میں دیکھ سکتا تھا رُوپی اور سکھدیپ کے درمیان ایک خاموش چاہتا کا ناتا ہے..رُوپی ایک بچے کی مانند اُس کا خیال رکھتی ہے لیکن وہ اپنی اداسی سے باہر نہ آتا تھا..

○○○○○

''سمندر ساؤتھ اینڈ کا.. کیسپئین سمندر اور اب سکھدیپ کے ساتھ آسٹریلیا کا سمندر''

ایک صبح ناشتے کے بعد میں نے سکھدیپ سے کہا.. سب لوگ کہتے تھے کہ یہ جو سینٹ آئیوز کا علاقہ ہے یہ سمندروں میں گھرا ہوا ہے.. ہر گھر سے سمندر اتنا نزدیک کہ باہر نکلو اور احتیاط نہ کرو تو نیلے پانیوں میں جا گرو تو کہاں ہے سمندر..

''چوہدری ہم دونوں کے ماضی میں جو دو شہر تھے وہاں سمندر تھا، ساؤتھ اینڈ تو تھا ہی سمندر کنارا اور تہران سے کیسپئن سمندر اگرچہ دور تھا لیکن ہم وہاں گئے اور ہاں تمہیں یاد ہے کہ جب ہم صبح سویرے واپس تہران پہنچے تھے تو میری سپورٹس کار کی بیلٹ ٹوٹ چکی تھی اور میں اُسے تمہارے مسافر خانے کے نیچے پارک کر کے ٹیکسی پر گھر گیا تھا.. مجھے یاد نہ تھا... اور یہاں سڈنی میں بلکہ سینٹ آئیوز میں بھی سمندر ہے اور آج ہم اُس کے کناروں پر ایک پکنک لنچ کریں گے..''

''نہائیں گے؟''

''تو کیسپئن پہنچ کر آدھی رات کے وقت نہانے سے انکاری ہو گیا تھا تو یہاں.. آسٹریلیا کے سمندروں میں شارک مچھلیاں بہت ہوتی ہیں.. نہانا شہانا نہیں ہے صرف کھانا ہے۔

ہم چند لمحوں کے سفر کے بعد گھاس کے ایک وسیع میدان میں اترے جس کے نشیب میں تا حد نظر نیلگوں سمندروں کی لہریں ٹھاٹھیں مارتی، جھاگ اڑاتی، ساحلوں کی چٹانوں سے سر پٹختی تھیں، جھاگ ہی جھاگ ہوتی تھیں اور اُس سمندر کے سفید ساحلوں پر بے شمار لوگ دھوپ سینکتے تھے، پانیوں میں تیرتے ابھرتے تھے..

یہ میری زندگی کے دل میں ہمیشہ کے لئے تصویر ہو جانے والے، دل کو روکنے والے منظروں میں

سے ایک تھا..

چٹانوں کی کوکھ میں سمندر کی جانب اپنے دل کش رُخ کئے ایسے گھر تھے جن میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں سے حسد ہوتا تھا کہ یہ دن رات انہی نیلگوں سحر طراز منظروں میں رہتے ہیں..

البتہ اس سمندروں کے منظر پر حاوی ہونے والے گھاس کے میدان میں ہوا بہت ہی تیز تھی..

سکھد یپ ایک میز پر دوپہر کے کھانے کے بندوبست سجا رہا تھا لیکن ہوا اتنی تیز تھی کہ فرنچ فرائز اڑے جاتے تھے، اور اگر ہم اُنہیں قابو نہ کرتے تو روسٹ مُرغ فضائے بسیط میں پرواز کر جاتے..سکھد یپ کے گتے کے گلاس میں سے سنہری وائن چھلک چھلک جاتی تھی اور سب سے پُرلطف شکل مُونا کی ہوئی جاتی تھی، ہوا کی شدت سے اُس کے بال یُوں کھڑے ہو گئے تھے کہ وہ ایک برگزیدہ پنک لگتی تھی..بہت گہرائی میں سمندر کی جھاگ رینگتی چلی آتی تھی اور ساحل پر بچھ کر ریت میں گُم ہو جاتی تھی..

گھاس کے میدان میں ایک شخص ایک چینی پتنگ اڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ تیز ہوا کی تاب نہ لا کر پھڑ پھڑاتی ہوئی گر جاتی تھی..

ساؤتھ اینڈ کا گدلا سمندر، کیسپین کا نیلونیل سمندر گئی شب میں اور سینٹ آئیوز کا یہ جھاگ آلود سمندر..اور ہمیشہ میں اور سکھد یپ..

سکھد یپ نے سنہری وائن کا آخری گھونٹ بھرا اور گتے کے گلاس کو میز پر رکھ دیا اور اُسی لمحے ہوا اُسے اُڑا لے گئی..وہ گھاس کے میدان پر گر کر ساکت ہو گیا..میرے ناول ''قربت مرگ میں محبت'' کے دو کردار خاور اور سلطانہ شاہ، ٹیکسیلا کے سٹوپے مُہرہ مُرادو کے عقب میں جو پہاڑیاں بلند ہوتی ہیں وہاں ایک چمگادڑوں بھری غار کے باہر ایک دوپہر گذارتے ہیں اور گتے کے گلاسوں میں مشروب پیتے ہیں..اور جب اُن میں سے ایک کردار مرگ سے دوچار ہوتا ہے تو دوسرا پھر اُسی بلندی پر اُس غار تک جاتا ہے اور وہاں گتے کے وہ گلاس ابھی تک موجود اوندھے پڑے ہیں..تو مجھے ہوا کے زور سے اُڑ جانے والے اُس گتے کے گلاس کو گھاس پر ساکت پڑے دیکھ کر خیال آیا کہ..کون جانے کب کوئی اِدھر آئے اور اس گلاس کو دیکھ کر ہم میں سے جو کوئی بھی پہلے رخصت ہو جائے اُسے یاد کرے..

گھاس پر ساکت پڑا گتے کا گلاس زندگی کی بے ثباتی کا ایک سفید ثبوت تھا..ایک کتبہ تھا..

واپسی پر ہم ایک ''بانسائی نرسری'' میں رُک گئے..

جیسے مجھے کبھی گندھارا کا، نوادرات کا، تصویروں کا دل کا عارضہ لاحق ہو جاتا تھا ایسے ان دنوں مجھے

جاپانی مختصر درختوں ''بانسائی'' کا عارضہ لاحق ہو چکا تھا..اور میں اُس اشتیاق اور مسرت کو بیان نہیں کر سکتا جب میں نے قطار اندر قطار لاتعداد بانسائی مختصر درختوں کے عجوبے دیکھے..

ویسے اس لمحۂ موجود میں میری سٹڈی ٹیبل پر باکس وُڈ کا ایک ایسا بانسائی ٹیبل لیمپ کی روشنی میں نمایاں ہوتا ہے جس کی شاخیں ایک چٹان کے گرد لپٹی ہوئی ہیں اور اُن میں سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھُول کھلے ہیں..

ہم گھر لوٹے تو شیرانا راض ناراض ہمارے قریب نہ آتا تھا کہ مُجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے..

○○○○○

محمد طارق اقبال
پاکستانی ویب سائٹ
ڈاٹ کام

''کینبرا... ہمارا پہلا کنگرو.. ڈاکٹر محمد علی کا گھر اور...
اس شہر میں میرا بھائی رہتا تھا''

میں نے زندگی بھر صرف ایک کھانے کی خاطر کم از کم چھ سو کلومیٹر کا طویل سفر کبھی اختیار نہیں کیا.. تو پھر مجھ پر کونسی افتاد پڑی تھی کہ میں سڈنی کی رونقیں شونقیں، سکھد یپ کے گھر کو چھوڑ کر ایک ایسے سفر پر آمادہ ہو گیا جس کا راستہ بھی خوش نظر نہ تھا لیکن جاوید نظر مجھے مائل کرتا تھا'' تارڑ صاحب کینبرا میں پاکستان کے ہائی کمشنر آپ کے اعزاز میں ایک لنچ کا اہتمام کرنا چاہتے ہیں، آپ کی عزت افزائی کرنا چاہتے ہیں اور ان دنوں جو ڈپٹی ہائی کمشنر خاتون ہیں، وہ آپ کے بیٹے سلجوق کی کولیگ ہیں.'' تو میں نے کہا کہ جاوید مجھے یہ منطق سمجھ نہیں آتی کہ وہ مہربان سفارتی لوگ اگر میری عزت افزائی کرنا چاہتے ہیں تو یہاں سڈنی میں آ کر کیوں نہیں کر لیتے.. کینبرا طلب کر کے زبردستی میری عزت افزائی کیوں کرنا چاہتے ہیں.. تو جاوید نے اپنی ریش مبارک کو خوب خوب سنوارا اور کہنے لگے'' تارڑ صاحب.. کینبرا، آسٹریلیا کا صدر مقام ہے۔ چنانچہ پاکستانی ہائی کمشنر بھی وہیں تعینات ہیں تو آپ کی عزت افزائی بھی وہیں ہو سکتی ہے..''

ویسے مجھے بچپن سے ہی عزت افزائی کروانے کا بہت شوق ہے لیکن اس کے سوا کینبرا مختلف ذاتی حوالوں سے میرے لئے کشش رکھتا تھا.. ایک تو یہ کہ میرا سب سے عزیز اور قدیمی بچپن کا دوست خاور زمان آسٹریلیا میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے کینبرا میں ہائی کمشنر رہ چکا تھا اور ان دنوں اُس کا بیٹا علی وہاں اپنی بیگم اور خاور خاندان میں پیدا ہونے والی بالآخر ایک بیٹی کے ہمراہ پی ایچ ڈی کر رہا تھا.. اور پھر انہی دنوں میرا ایک مرمٹ جانے والا فین، علوی، جس نے میرے حوالے سے ابھی حال ہی میں ایک ویب سائٹ لانچ کی تھی، وہ بھی موجود تھا.. لیکن.. بنیادی طور پر میں میمونہ کے لئے کینبرا جاتا تھا جو اس شہر کے نام سے ہی آبدیدہ ہو کر ایک سرگوشی میں کہتی تھی'' میرا بھائی وہاں رہتا تھا..''

کینبرا کے راستے میں صرف ایک مقام کسی حد تک گمنام تھا جہاں میں رُکنا چاہتا تھا، جہاں گریٹ ڈان بریڈ مین پیدا ہوا تھا، لیکن وہ مقام ہماری بے خبری میں گذر گیا.. آج یہ جاوید نہ تھا بلکہ مصطفےٰ جیسا ''ونڈر فل'' شخص تھا جس نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ مجھے کینبرا لے جائے گا، ماڈل ٹاؤن پارک میں یوگا سکھانے والے بابا جی کسی بھی آسن کے مکمل ہونے پر نعرہ لگایا کرتے تھے ''ونڈر فُل'' تو یہ وہی دھیما، تمبا کو نوش مصطفےٰ تھا جو ''ونڈر فُل'' تھا..

کینبرا کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ یہ ایک اور اسلام آباد ہے بلکہ شائد ان دونوں شہروں کا ماہر تعمیر ایک ہی یونانی شخص ہے.. وہی ناک کی سیدھ میں جاتی سپاٹ شاہراہ جس کے اختتام پر پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت ہے.. کُھلے ایونیو.. ستھری سڑکیں، سرسبز رہائش گاہیں لیکن بے رُوح.. بے رُوح.. سُونا سُونا، تنہا اور اپنی جدیدیت کی اداسی میں گُم..

جب ہم ایک وسیع پارکنگ لاٹ میں جا رُکے تو وہاں ڈاکٹر محمد علی ہمارے استقبال کی خاطر دھوپ میں مزید سُوکھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کی صحت سے اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہیں اور اس کے باوجود آسٹریلیا میں تیار کردہ کُل دنیا میں برآمد کی جانے والی ادویات کے معیار کی چیکنگ وہ کرتے تھے..

کینبرا مجھے پسند نہ آ رہا تھا..

ہمیں فوری طور پر براہ راست ایک تُرک ریستوران ''عثمان'' نام کے میں لے جایا گیا جہاں ایک مخصوص کمرے میں پاکستانی ہائی کمشنر مالک صاحب اور ان کے ماتحت سفارت کار جانے کب سے ہمارا انتظار کرتے جمائیاں لے رہے تھے..

ہماری طویل میز پر تُرک خوراکیں سجتی گئیں اور میں اپنے دانتوں کے جل ترنگ کے باوجود اُنہیں نگلتا لطف اندوز ہوتا گیا..

سلجوق کی کولیگ، میمونہ آنٹی کی دیکھ بھال کر رہی تھیں..

تُرک خوراک کی مہک مجھے چوالیس برس پیشتر کے ارض روم میں لے گئی جب ایک ریستوران میں ویٹرس میرا ہاتھ تھام کر مجھے باورچی خانے میں لے گئی اور دیگچوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر تُرک خوراکوں سے میرا تعارف کروایا.. مجھے چاول بھرے بینگن اور ٹماٹر بے حد پسند آئے تھے، میں نے منیجر کو اشارہ کر کے بلایا اور سرگوشی کی ''کیا آپ کے ہاں چاول بھرے بینگن اور ٹماٹر ہیں؟''

اُس کی مسرت دیدنی تھی ''کیا آپ ان اناطولیہ کی دیہاتی خوراکوں سے واقفیت رکھتے ہیں؟ ابھی پیش کرتا ہوں..''

عبداللہ مالک صاحب ایک بہت دھیمے مزاج کے ہمہ وقت مسکراتے ہوئے شخص تھے شائد اس لئے کہ اُن کی بیگم جاپانی تھیں تو وہ جاپانیوں کی مانند ہی انکسار پسند اور محبت کرنے والے تھے.. میں نے جب خاور زمان سے اپنی قُربت کا تذکرہ کیا تو جو سفارت کار اُس کے زمانے میں کینبرا میں تھے، وہ سب بیک زبان اُس کی ذہانت، سادگی اور شخصیت کی کشش کی توصیف کرنے لگے، ایک صاحب کہنے لگے، خاور صاحب آسٹریلین لوگوں سے بڑھ کر وقت کی پابندی کرتے تھے، باقاعدگی سے ٹینس کھیلتے تھے اور ایسا ستھرا لباس پہنتے تھے جیسے ومبلڈن کا فائنل کھیلنے آئے ہیں..

ہم لنچ سے آسودہ ہو کر فارغ ہوئے تو ڈاکٹر محمد علی نے راہنمائی کے فرائض سنبھال لئے ''میں آپ کو آسٹریلیا کی شاندار پارلیمنٹ کی عمارت دکھاؤں گا جس کے ماتھے پر کنگرو اور شتر مرغ کی شبیہہ ہے.. کینبرا کے حیرت انگیز نظارے دکھاؤں گا جو کُچھ تارڑ صاحب آپ خواہش کریں گے، وہ دکھاؤں گا.'' تو میں نے کہا ''سر آپ مجھے اور کچھ نہ دکھایئے پلیز ایک کنگرو دکھا دیجیے..''

ڈاکٹر صاحب کو خفیف سا صدمہ ہوا کہ پاکستان سے آنے والا یہ ادیب کیسا ہے کہ نہ تو اس نے نیشنل لائبریری دیکھنے کی خواہش کی ہے اور نہ ہی مقامی ادیبوں سے ملاقات کی فرمائش کی ہے.. ایک بیہودہ سا جانور دیکھنے کا تمنائی ہے.. لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ جب سے میں آسٹریلیا آیا تھا کنگرو کنگرو پکارتا پھرتا تھا.. ادھورا پھرتا تھا.. اور اگر میں ایک بھی کنگرو دیکھے بغیر پاکستان واپس چلا جاتا ہوں تو لوگ کیا کہیں گے کہ دیکھو یہ وہ شخص ہے جو آسٹریلیا گیا اور اس نے کنگرو بھی نہیں دیکھا.. اب جاوید نظر کو دیکھنا تو کنگرو دیکھنے کا متبادل نہیں ہو سکتا تھا..

میں نے ڈاکٹر محمد علی کا دل رکھنے کی خاطر آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کا دورہ کیا، ہر شے میں اپنے آپ پر جبر کر کے دلچسپی کا اظہار کیا اور پھر کہا ''کنگرو..''

''میں آپ کو..'' اُنہوں نے شہادت کی انگلی بلند کر کے کہا ''انشاء اللہ، ایک نہیں، بہت سے کنگرو دکھاؤں گا.. میرے انسٹی ٹیوٹ کے سامنے ایک کُھلا علاقہ ہے اور وہاں کنگرو بہ کثرت پائے جاتے ہیں..''

''ویسے ڈاکٹر صاحب.. یہ فرمایئے کہ جیسے بکرا اور بکری ہوتے ہیں، ہاتھی اور ہتھنی ہوتے ہیں تو کنگرو اور.... یعنی مادہ کنگرو کیا کہلاتی ہے؟..''

''آہم..'' ڈاکٹر صاحب کھانسے ''میں نے کبھی غور نہیں کیا..''

ہماری کاریں ڈاکٹر صاحب کے انسٹی ٹیوٹ کے باہر پارکنگ لاٹ میں جا رُکیں.. ہم باہر نکلے اور اُن کی ہدائت کے مطابق کُھلے علاقے کی جانب نگاہیں آوارہ کر دیں، بہت آوارگی کے بعد ہمیں بہت دور کُچھ ہیولے سے نظر آئے، غور کیا تو کنگرو سے نظر آئے اور وہ اتنے فاصلے پر تھے کہ آسانی سے بڑے گیدڑ بھی ہو

سکتے تھے اور یُوں بھی اس عمر میں نظر قدرے ناتواں ہو جاتی تھی اور لیلےٰ نظر آتا تھا اور مجنوں نظر آتی تھی..
بہرطور ڈاکٹر صاحب کے بیان پر یقین کرنا پڑا کہ وہاں کنگرو سے تو ہیں..ویسے وہ قدرے پژمردہ سے ہوئے یعنی ڈاکٹر صاحب کہ معزز مہمان مُجھ پر شک کرتے ہیں..میں انہیں گیدڑ دکھا کر انہیں کنگرو قرار دے رہا ہوں تو وہ کہنے لگے ''میں آج آپ کو کنگرو دکھا کر رہوں گا اور اتنی نزدیکی سے کہ آپ اُن کے سینے کی پوٹلیوں میں سے جھانکتے اُن کے بچّوں کو بھی ''ہیلو ہیلو'' کہہ سکیں..''

سورج ڈھل چکا تھا، ایک نیم ویرانہ تھا جہاں کہیں کہیں بے آباد لگتی رہائش گاہیں تھیں..ہم نے ایک ڈھلوان سطح بمشکل عبور کی اور پھر سورج کی آخری کرنوں میں وہاں درجنوں کنگرو ہماری آنکھوں کے سامنے تھے، اُن میں سے کُچھ صُوفی منش کنگرو مراقبے کی حالت میں اگلی ٹانگیں اٹھائے گیان دھیان میں گم تھے اور کچھ چُلبلے اور شوخ سے کنگرو باری باری اُچھلتے تھے جیسے کیڑی کاڑا کھیل رہے ہوں..بقیہ لوگ تو واپس چلے گئے لیکن میں کیمرہ سنبھالے اپنے آپ کو کو جھاڑیوں میں روپوش کرتا اُن کے بہت قریب چلا گیا..

سُورج ڈوب چکا تھا اور وہ پرچھائیاں سے کنگرو ہوئے جاتے تھے..اور تب وہ میری قربت سے آگاہ ہو کر قدرے چوکنے ہو گئے، اپنی اگلی ٹانگیں اٹھائے مُجھے حیرت اور حماقت سے تکنے لگے..میں اُن کے مزید قریب ہوا جاتا تھا کہ ذرا نزدیکی سے اُن کی تصویریں اپنے پوتے ابراہیم کے لیے اتار لوں کہ حال مقیم نیویارک اس حضرت ابراہیم کو ان دنوں جانوروں کا خبط ہو چکا تھا..وہ جانوروں اور سمندری حیات یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہو چکا تھا..اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے بابا کی بجائے کسی اینا کونڈا اژدھے سے لپٹ کر سو جائے اور وہ ان دنوں ایک مصنوعی پلاسٹک کے بہت بڑے سانپ کو گلے میں ڈالے گھر میں چلتا پھرتا تھا اور جب کبھی اپنی ماما رابعہ کے سامنے آتا تھا تو اُس کی چیخیں نکل جاتی تھیں..اور جب میں نے اُسے بتایا کہ میں آسٹریلیا جا رہا ہوں تو ابراہیم نے فرمائش کی کہ دادا..وہاں سے مُجھے ایک نیلی وہیل چاہئے اور ایک کنگرو چاہئے..میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ ایک کنگرو کو آسٹریلیا سے لاہور اور پھر نیویارک ٹرانسپورٹ کرنے میں کُچھ دشواریاں سی ہیں، یعنی پرواز کے دوران اگر ایک کنگرو بچّہ آپ کی گرفت سے آزاد ہو کر جہاز کی راہداری میں کُھدکنے لگے یا پھر ایئر ہوسٹس کی گود میں جا بیٹھے تو صورت حال کیسی ناخوشگوار ہو جائے، تو میں اُن کنگروؤں کے قریب ہو کر اُن کی ایک ایسی تصویر اتارنا چاہتا تھا جو میں ابراہیم کو بھیج سکوں..تاریکی اترنے لگی، غروب کی مدھم سُرخی بجھنے لگی اور وہ کنگرو اس تاریکی میں روپوش ہو گئے..

ڈاکٹر صاحب ہمیں کینبرا کے دامن کوہ میں لے گئے جس کی بلندی سے نیچے کینبرا کا پورا شہر قدموں

میں بچھا نظر آتا تھا..

''یہاں سے کینبرا یونیورسٹی نظر آتی ہے ڈاکٹر صاحب..'' میمونہ نے پوچھا..

''جی ہاں.. آپ کو پارلیمنٹ کی عمارت نظر آ رہی ہے ناں.. اس کے دائیں جانب خاصے فاصلے پر جو عمارتیں شام کی نیم سیاہی میں نظر آ رہی ہیں، وہ کینبرا یونیورسٹی ہے..'' میمونہ کی آبدیدہ آنکھیں اُس نیم سیاہی میں روپوش ہوتی عمارتوں تک گئیں اور بہت دیر کے بعد اُس کے ہونٹ مرجھاہٹ میں کُھلے... ''اس شہر میں میرا بھائی رہتا تھا..''

میں اُسے ڈھارس نہ دے سکتا تھا کہ ابھی چند ماہ پیشتر مانٹریال کے ایک فلیٹ میں اُس کا جینئس بھائی ڈاکٹر احمد شفاعت اپنی زندگانی کی تنہائی کی مانند تنہا مر گیا تھا..

اُس نے ایک سسکی بھری اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے ''اس شہر میں میرا بھائی رہتا تھا..''

میمونہ کے خاندان کی داستان کسی یونانی ڈرامہ نگار.. یورپڈیز یا ایسکلس کے المیاتی ڈراموں سے زیادہ الم ناک اور دردناک تھی..

اُن کے حصے میں بے مثال رفعتیں اور بلندیاں بھی آئیں لیکن اُن میں سے بیشتر تقدیر کے ہاتھوں مات کھا گئے..

وہ نو بہن بھائی تھے.. پانچ بھائی اور چار بہنیں..

بہنیں کسی حد تک بخت آور رہیں لیکن بیشتر بھائی، ہر ایک اپنی شخصیت اور نظریئے میں منفرد، بدقسمت رہے..

بڑے بھائی انور، اسلم خان، ظفر خان اور ابھی چند ماہ پیشتر احمد شفاعت مرتے گئے..

میمونہ سے شفاعت کی غیر متوقع موت کا دُکھ نہ سنبھالا گیا.. وہ کہتی تھی کہ نہ میں نے اُن کی شکل دیکھی، نہ یہ جانتی ہوں کہ وہ مانٹریال کے کس قبرستان میں دفن ہیں لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بھی اُن کے ساتھ دفن ہو چکی ہوں..

وہ کچھ روز شفاعت کے ہاں مانٹریال میں گذار کر آئی تو یہی کہتی تھی ''وہ بہت اکیلے ہیں، بہت اکیلے ہیں..''

احمد شفاعت، جو میری شادی کے موقع پر ایک چھریرا سا، بہت خاموش نوجوان تھا بلاشبہ میمونہ کے خاندان کا ایک جینئس تھا.. جس نے 1968ء میں کینبرا یونیورسٹی سے حساب کی ڈگری متعینہ مدت سے نصف

مدت میں حاصل کر لی اور جس کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا تھا کہ یہ نوجوان نوبل پرائز میٹریل ہے..
جو راتوں کو بیدار ہو کر بستر کی سفید چادر پر حساب کے سوال حل کرنے لگتا، اگلی سویر جب اُس کی ماں، میری ساس صاحبہ کمرے میں داخل ہوتیں تو وہ ایک کونے میں دبکا بیٹھا ہوتا اور کہتا ''بے بے جی..ان چادروں کو نہ چھونا..میں نے حساب کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر لیا ہے۔''

وہ دیارِ غیر میں گیا، دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں میں حساب پڑھاتا رہا اور اپنے خاندان سے اتنا غافل ہو گیا کہ اپنی ماں کی وفات پر بھی پاکستان نہ آیا.. مُونا نے شکائت کی تو کہنے لگا ''میمونہ..یہ سب رشتے ناطے محض رسمیں ہیں، جذبات کے اُبال ہیں، اصل شے سچ کی تلاش ہے..''

اور پھر اطلاع ملی کہ احمد شفاعت نے حساب کو ترک کر دیا ہے اور مذہب سے رجوع کر لیا ہے..

اور جب پی آئی اے میں ڈپٹی منیجنگ ڈائرکٹر کے عُہدے پر فائز میرے پسندیدہ اسلم خان نے اُسے پوچھا کہ شفاعت تم تو حساب کے شعبے میں نوبل پرائز کی جانب بڑھ رہے تھے تو تم نے حساب کو کیوں ترک کر دیا تو شفاعت نے کہا ''بھائی جان میں تحقیق کے اُس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں مجھے حساب اور اللہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا، یہ دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے چنانچہ میں نے اللہ کو پسند کر لیا..'' اور ایک بار جب اسلم خان نے اپنے بھائی کے لئے فکرمند ہوتے ہوئے اُسے کہا کہ شفاعت تم اس دنیا کو کیسے بدل سکتے ہو..ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے اور وہ نہ بدل سکے تو تم کیسے بدل سکتے ہو تو شفاعت نے کہا..''بھائی جان آپ منطق کے اصولوں سے روگردانی کر رہے ہیں، اگر وہ اس دنیا کو نہیں بدل سکے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میں نہیں بدل سکتا..''

اسلم خان نے پاکستان واپس آ کر کہا..''اب شفاعت کا کچھ نہیں ہو سکتا..وہ کسی اور جہان میں جا چکا ہے..''

شفاعت مذہب میں اور فقہ میں اتنا گم ہو گیا کہ اُس کے لئے ہر شے، رشتے ناتے اور خاندان بے معنی ہو گئے..

اُسے فخر تھا کہ جب وہ مانٹریال میں آیا تو وہاں صرف ایک مسجد تھی جس پر تالا لگا رہتا تھا اور اُس نے وہاں اذان دی..اور آج اس شہر میں باون مسجدیں ہیں اور مرکزی مسجد کا مصری امام جب رخصت پر جاتا ہے تو احمد شفاعت وہاں امامت کرواتا ہے..یہ ڈاکٹر احمد شفاعت تھا، میمونہ کا بھائی، جسے وہ کینبرا میں یاد کرتی آبدیدہ ہوتی تھی ''میرا بھائی اس شہر میں رہتا تھا..''

اور یہ اُس کی محیر العقول حیات کے کچھ حوالے تھے..اور نہ مجھے اور نہ ہی کسی اور کو یہ اختیار ہے کہ وہ

اعتراض کرے کہ اُس نے حساب کیوں ترک کر دیا، ایک ممکنہ نوبل انعام سے کیوں مُنہ موڑ لیا اور مذہب کی جانب رُخ کر لیا..

میں جب کبھی کینیڈا جاتا تو اس گمشدہ سے میمونہ کے بھائی کو ملنے ضرور جاتا..ایک ملاقات پر شفاعت کہنے لگا.."آپ اسلام کی تاریخ سے مجھ سے زیادہ آگاہ ہیں..میں نے "غار حرا میں ایک رات" پڑھی ہے..مجھے یقین ہے کہ یہ آپ پر نازل ہوئی ہے.."

تو میں نے، کیونکہ وہ مجھ سے چھوٹا تھا، سرزنش کی "شفاعت..یہ تو محض ایک آوارہ گرد کے جذبات کی ترجمانی ہے..جسے مذہب سے لگاؤ نہیں لیکن..وہ قصوی کے سوار کے عشق میں مبتلا اُس اونٹنی کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے.."

مُونا کی سوگواری میں کوئی بھی شامل نہ ہو سکتا تھا..

وہ اُس بلند سطح سے نیچے پھیلے شہر کو دیکھتی تھی اور کہتی تھی "اس شہر میں میرا بھائی رہتا تھا.."

وہ اُس کی موت پر بہت روئی تھی..

کیا یہ ایک یونانی المیہ ڈرامے کے کسی بھی منظر سے زیادہ المناک منظر نہیں ہے کہ ایک بہن سات سمندر پار ایک شہر لاہور سے آئی ہے، ایک اجنبی شہر کینبرا میں آئی ہے اور وہ دو ماہ پیشتر اُس سے بچھڑ جانے والے بھائی کو یاد کرتی ہے جو مانٹریال میں دفن ہے..لاہور، کینبرا اور مانٹریال درد کی ایک ہی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں..میں نے اُسے آبدیدہ ہونے دیا..رونے دیا..

"اس شہر میں میرا بھائی رہتا تھا.."

وہ کینبرا کے مضافات میں جن کی دل کشی شب کی سیاہی میں سے بھی ظاہر ہوتی تھی ایک دوستانہ جذبوں کا گھر تھا جہاں ہم رات کے کھانے کے لئے مدعو کئے گئے تھے..اور یہ ڈاکٹر محمد علی کا گھر تھا..

وہاں علی زمان اُس انکل سے ملنے آیا تھا جس نے اُسے گود کھلایا تھا اور اب وہ اپنی نایاب بیٹی کو گود میں لئے بڑے فخر سے ہم سے داد طلب کرتا تھا کہ دیکھئے خاور خاندان میں بالآخر ایک بیٹی نے جنم لے لیا ہے، اُس کی بیگم بھی اپنے سُسر کے بچپن کے دوست پر نثار ہوئی جاتی تھی..مُونا..فاطمہ..کی ویڈیو بنا رہی تھی تا کہ لاہور واپسی پر اسے خاور اور نگہت کو دکھا سکے کہ دیکھو تمہاری اکلوتی بیٹی کتنی کیوٹ ہو گئی ہے..سعد علوی جس نے ابھی کچھ عرصہ پہلے میرے حوالے سے ایک ویب سائٹ لانچ کی تھی اور ابھی حال ہی میں کینبرا منتقل ہوا تھا، مسلسل

تصویریں اُتار رہا تھا اور ڈنر سے پہلے یہ تصویریں میری فیس بک اور ویب سائٹس پر "جاری" ہو چکی تھیں اور دنیا بھر کے دوستوں اور عزیزوں کو خبر ہو چکی تھی کہ ہم اس لمحے کینبرا میں پائے جاتے ہیں.. ڈاکٹر محمد علی نہ صرف ایک مہربان میزبان تھے بلکہ ایک منجھے ہوئے براڈ کاسٹر بھی تھے اُنہوں نے کسی مقامی ریڈیو کے اردو پروگرام کے لئے مجھ سے نہائت فکر انگیز سوال پوچھے.. میز پر سجی ڈشز دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہم کسی ممتاز شیف کے پروگرام میں شرکت کر رہے ہیں..

گئی شب جب ہم سڈنی کی طویل مسافتوں کے مسافر ہو گئے. کینبرا سے لوٹتے تھے تو مُونا کی آنکھیں سُوجی ہوئی لگتی تھیں، آبدیدگی سے مزید بڑی ہو گئی تھیں اور اُن میں ایک ہی فریاد کبھی جھلملاتی، کبھی ڈوبتی تھی کہ.. اُس شہر میں میرا بھائی رہتا تھا..

○○○○○○

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

''عرش پر مکاں..ڈاکٹر سعید خان کا مکاں..اشرف شاد اور سڈنی کا سب سے خوبصورت دن''

؎ کاش کہ ہوتا عرش پہ اِک مکاں اپنا..

یا پھر..

؎ پہلو میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو..

یہاں ایک دھیرے سے بہتے دریا میں دھیرے سے بہتی بادبانی کشتیاں تھیں اور دریا کنارے ابھرتی چٹانوں کی بلندیوں پر ڈاکٹر سعید خان کا گھر تھا..

وہ سڈنی کا ایک چمکیلا اور روشن دن تھا جس کی نتھری فضا میں ٹھنڈک کے گیلے بوسے تھے جب ڈاکٹر سعید خان نے مُجھے اور میمونہ کو اپنے خوابناک گھر میں مہمان کیا..بے شمار لوگ مدعو تھے جن کی اپنی ہی ایک الگ کلاس تھی، جُدا دنیا تھی، خورد و نوش کے بے دریغ انتظامات ایسے تھے کہ ہر کوئی بے دریغ خوش ہوتا تھا..

اس گھر کے ٹیرس سے جھانکئے تو آنکھیں گرتی چلی جاتی تھیں، نشیب میں بہتے دریا میں رواں کشتیوں کے بادبانوں پر تصویر ہو کر بہنے لگتی تھیں..ہم بلندیوں پر تھے اور دریا پار گھنے جنگل تھے، چٹانوں میں پوشیدہ گھر تھے..اور نشیب میں بہتا یہ دریا دھیرے سے بہتا تھا کہ..

؎ میرے سیّاں جی اتریں گے پار ندیا دھیرے بہو..ایسے بہتا تھا..

صدر دروازے پر ڈاکٹر سعید خان اور اُن کی خوش لباس اور خوش آثار اہلیہ نے ہمارا استقبال کیا، گھر کی آرائش، آسائش اور زیبائش کو نظر میں اُتارتے ہم نے جانا کہ یہ شخص زندگی بسر کرنے کے ذوقِ جمال سے آراستہ ہے..

مہمان جتنے بھی تھے اور وہ بہت تھے اُن کی نشست و برخواست، گفتگو کے انداز اور پیراہنوں سے

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی دیگر پاکستانیوں کی مانند کنویں کے مینڈک ہو کر ''منی میکنگ مشین'' نہیں ہو گئے، زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں.. اُن کے چہرے اور بدن طمانیت اور مسرت کے جھرنوں کی پھوار سے بھیگتے تھے.. وہ خوش لباس تو حد درجہ تھے لیکن خوش اخلاق اور خوش مزاج بھی تھے کہ وہ کسی بھی کامپلیکس کا شکار نہ تھے.. اُن میں سے بیشتر مجھ سے ملنے کے تمنائی تھے اور میں بھی اُن کی اُلفتوں کے زیر اثر معمول سے زیادہ پُر مسرت ہو گیا... بے شک اس رہائش گاہ کا اندرون ایسا تھا کہ ہر سجاوٹ اور ہر آرائش دل کو خوشی سے بھر دینے والی تھی لیکن میں کسی نہ کسی بہانے، اکثر سگرٹ پینے کے بہانے اپنے سے محبت کرنے والوں سے 'جدا ہوتا، شرمندگی سے معذرت کرتا بار بار اُس بالکونی میں جا کھڑا ہوتا جہاں سے ایک چٹان نیچے گرتی دریا تک جاتی تھی اور اُس دریا میں جو بادبانی کشتیاں یہاں سے ساکن سی لگتی تھیں جن کے بادبان سڈنی آپرا کی یاد دلاتے تھے، ایک کھلونا سی لگتی تھیں.. ساکن لگتی تھیں لیکن تھم تھم کر بہتی تھیں.. تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے، پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے.. تو یہ بادبانی گوریاں اس بلندی سے لگتا تھا کہ تھم تھم کے چلتی تھیں لیکن ان کے پاؤں میں پانیوں کی جو جھانجھریں بندھی تھیں اُن کی چھم چھم مجھ تک اس بلندی پر بھی 'مجھے سنائی دیتی تھی..

ڈاکٹر سعید میرا بہت دھیان رکھتے تھے.. مجھے تلاش کرتے بالکونی تک آ جاتے اور کہتے ''مجھے معلوم تھا کہ آپ یہیں پر ہوں گے... آپ لوگوں سے زیادہ منظروں سے باتیں کرنا پسند کرتے ہیں... آپ نے پاکستان لوٹنے سے پہلے مجھے کم از کم ایک شب دینی ہے، میں آپ کو سڈنی کے سب سے خوش نظر ریستوران میں لے چلوں گا اور پھر واپس آ کر ہم اسی بالکونی میں کافی پئیں گے.. آپ نے وقت نکالنا ہے..''

ایک نہائت چنچل نوعیت دل میں زبردستی اتر جانے والی لڑکی جہاں میں جاتا تھا، وہیں چلی آتی تھی اور اپنی خوبصورت آنکھیں کیمرے کے ویو فائنڈر سے لگائے مسلسل میری تصویریں اُتار رہی تھی.. تو میں نے کہا کہ.. بی بی، اس تمہاری مسلسل کھٹ کھٹ تصویر کشی کا مجھے تو چنداں فائدہ نہیں کہ میں نے تمہاری اتاری ہوئی تصویریں کہاں دیکھنی ہیں..

''آپ دیکھیں گے..''

اور واقعی اُس سنہری دوپہر میں اتاری گئی وہ سب ای میل کے ذریعے مجھ سے پہلے پاکستان پہنچ چکی تھیں تو اے سنہری لڑکی بہت بہت شکریہ.. میں دعا کرتا ہوں کہ اگر تمہاری شادی نہیں ہوئی تو ہو جائے.. اگر ہو چکی تو تم بے شمار بچوں کو جنم دو.. اور اگر یہ بھی ہو چکا ہے تو آئندہ احتیاطی تدابیر اختیار کرو لیکن شکریہ!

یقین کیجیے اس محفل میں جاوید نظر بھی.. شائد اُن کے نزدیک ایک مخرب الاخلاق محفل، وہ بھی کیسے لطف اٹھاتے مسکراتے پھرتے تھے، اُدھر انجم ایاز سات آسمانوں میں سے کم از کم تین آسمانوں تک تو پہنچ چکے

تھے اور ستاروں پر کمندیں ڈالتے تھے.. میں منتظر تھا کہ کب وہ ساتویں آسمان تک پہنچتے ہیں جہاں میں اُن کا انتظار کرتا تھا.. ایک مدبر.. ساڑھی میں ملبوس، خوش شکل رہ چکی، ماتھے پر تلک لگائے ہندوستانی خاتون سے تعارف کروایا گیا کہ یہ دوردرشن ٹیلی ویژن کی سب سے پہلی میزبان ہوا کرتی تھیں اور وہ کیا ہی خوشگوار خصلت کی خاتون تھیں..

اُن کے گھنے سفید بالوں والے خاوند اُن کے ہمراہ تھے، اپنی اہلیہ کی ناموری کے سائے میں زندگی بسر کرتے تھے، جب کہ عظمیٰ گیلانی تنہا تھیں اُن کے صوفی منش سفید ریش خاوند وہاں نہ تھے کہ اُنہوں نے نہ ہونا تھا.. اور وہ کبھی نہ ہوتے تھے.. اُس محفل میں سب سے ڈیشنگ سفید مونچھوں والا.. ایک دل فریب اور بقول کسے رنڈی باز بش شرٹ میں ملبوس جو کہ برونائی کے دنوں کی یادگار تھی، اشرف شاد تھا.. بے شک آسٹریلیا میں سب سے نمایاں تخلیق کار اور بلاشُبہ اردو کا ایک بڑا ناول نگار جس نے ''بے وطن'' ایسا یادگار ناول لکھا جو نہ صرف میرا بلکہ میمونہ کا بھی پسندیدہ ناول تھا.. اُس کے دیگر ناول بھی قابل توجہ تھے لیکن جب کبھی کسی ادبی میلے میں مجھے اردو ناول کے بارے لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا جاتا تو میں کبھی بھی اشرف شاد کا تذکرہ کرنا نہ بھولتا.. اگر بھولتا تو شدید قسم کی ادبی بددیانتی کا مرتکب ہوتا..

میں اپنی بالکونی سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اشرف شاد، اپنی برونائی رنڈی باز بش شرٹ اور سفید مونچھوں سمیت میرے بارے میں نہائت مبالغہ آمیز اور جذباتی گفتگو کر رہا ہے اور مہمان دم بخود بیٹھے ہیں.. یعنی خواتین و حضرات آپ اس تاریخی لمحے کی اہمیت سے آگاہ ہی نہیں ہیں کہ آج ہمارے درمیان تارڑ صاحب موجود ہیں.. آپ آج سے پانچ دس برس بعد نہائت فخر سے اپنے بچّوں کو بتائیں گے کہ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن ہم ایک ایسی محفل میں شریک تھے جہاں تارڑ صاحب بھی موجود تھے.. تو اس لمحے کو یاد رکھئے اور تارڑ صاحب سے جی بھر کے باتیں کر لیجئے..

اشرف شاد کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے دن تھوڑے رہ گئے ہیں.. ابھی کچھ روز پہلے مجھ سے محبت کرنے والوں نے، بلکہ میری تحریر سے اُلفت رکھنے والوں نے یکم مارچ کو ملک بھر میں میری سالگرہ کی تقریبات کا اہتمام کیا تھا اور وہ جو 23 مارچ کو علی آڈی ٹوریم میں تقریب ہوئی تھی جہاں میری حیات کے پچھتر برسوں کی سینکڑوں تصاویر نمائش پر تھیں.. بانو قدسیہ اور عبداللہ حسین مسند صدارت پر براجمان تھے.. ابرار الحق اور فریحہ پرویز میری سالگرہ کے گیت گاتے تھے اور سکرین پر راج موہن گاندھی اور گلزار صاحب کے مبارکبادی کے پیغام دکھائے جاتے تھے.. اور تب بھی مجھے احساس ہوا کہ میرے دن تھوڑے ہیں ورنہ اتنا ہنگامہ کیوں برپا ہوتا..

ویسے اگر دن تھوڑے تھے تو بھی کیا غم تھا..

ایسی چاہتیں اور محبتیں ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتیں، اگر مجھے نصیب ہو گئیں تو بے شک دن تھوڑے ہوں تو بھی کیا غم ہے..قلق صرف یہ تھا کہ دوپہر ڈھل گئی، شام ہونے لگی..

اور اُس شام میں، سعید خان کے گھر کی چٹانوں کی گہرائی میں سے، سامنے کے جنگلوں میں سے ایک ست رنگا پرندہ اُڑا اور میری آنکھوں میں اتر گیا..اُنہیں رنگوں سے بھر دیا..

میرے سیاں جی اتریں گے پار..ندیا دھیرے بہو

اے غزالِ شب..

تیری پیاس کیسے بجھاؤں میں!

OOOOOO

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

''اداسی کے سو رُوپ..سلمان اور عائشہ کا گھر..
احمد اور حسن کا گھر..ہمارا گھر''

اداسی کے سو رُوپ ہیں..

نانگا پربت کو مقامی زبان میں ''شل مُکھی'' یا سو چہروں والی کہا جاتا ہے تو اداسی کے بھی سو چہرے ہیں..اور ان میں سے سب سے زیادہ اُداس چہرہ ایک ایسی جُدائی کا ہے جس میں کبھی دوبارہ ملاقات کا امکان کم ہو..آپ حیات کی آخری دستکیں سُن رہے ہوتے ہیں اور کوئی بھی دستک آخری ہو سکتی ہے اس لئے سکھدیپ سے جدا ہونا دل میں ایک ہول بھرتا تھا، ہمیں آخری دستکیں سُنائی دے رہی تھیں، ہر سانس ریت کا ایک ذرّہ تھا جو سرکتا جاتا تھا، صحرا اپنے آخری ذرّوں میں سانس لیتا تھا..بے شک آپ دو چار برس اور جی لیں لیکن اُس جینے میں سو دُکھ تھے..بیماری، بے بسی، نقاہت اور بے چارگی کے بڑھاپے کے سو دُکھ..ہم نے دوبارہ کہاں ملنا تھا..

شائد ہم کُچھ دن اور سکھدیپ کے ہاں ٹھہر جاتے لیکن اُسے اگلے روز عزیزداری کی مجبوریوں کی وجہ سے نیوزی لینڈ جانا پڑ گیا تھا..

''ہم نے پورے تین روز بعد نیوزی لینڈ سے واپس آجانا ہے چوہدری. تم نے آسٹریلیا سے روانگی سے پہلے تین چار روز کم از کم میرے ہاں ضرور ٹھہرنا ہے.. یار ہم نے کوئی بلا گلا نہیں کیا، جشن نہیں منائے، بڑی گھریلو اور شریف زندگی گذارتے رہے تو تم نے آنا ہے..''

اور رُوپی کا رُوپ بھی زرد ہو رہا تھا..وہ اپنی عینک درست کرتی مُونا کی جانب کیسی اداسی سے تکتی تھی..اپنے گھٹنوں میں اٹھنے والی ٹیسوں کو سہتی مسکراتی تھی..اور تو اور شیرا کو بھی ہماری رخصتی کی خبر ہو گئی تھی اور وہ بجھی بجھی آنکھوں سے ہماری جانب دیکھتا تھا..

سلمان نے اپنی سیاہ لینڈ روور کو بیک گیئر لگا کر پیچھے کیا تو وہ تینوں بھی پیچھے رہ گئے..سکھدیپ اپنی

پُروقار سفید داڑھی میں قدرے جُھکا ہوا، رُوپی خالی نظروں سے ہماری جانب تکتی اور شیر اُدھم ہلار ہا تھا..

مُجھے معلوم تھا کہ ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے..انگلستان کے زمانے دفن ہوئے زمانے ہو چکے، تہران کے شب و روز ایک خواب ہو چکے اور اب سڈنی کے یہ دن بھی ابھی سے مدھم ہونے لگے تھے..انہوں نے بھی بُجھ جانا تھا..

ہم سلمان کے گھر جا آباد ہوئے..

ایک پُر آسائش گڑیا گھر جس کی زیبائش، ترتیب اور نفاست میں جمالیاتی ذوق کے کئی چاند ابھرتے تھے اور یہ سب چاند اُس کی بیگم ڈاکٹر عائشہ کے ہاتھوں کے تخلیق کردہ تھے..سلمان کا مختصر تعارف میں کروا چکا ہوں تفصیل کے لئے میرے سفرناموں سے رجوع کیجئے خاص طور پر ''سنولیک'' سے..

یہ وہی سلمان تھا جس نے چودہ اگست کے یوم آزادی کی خوشی میں سنولیک پر ایک پتنگ اُڑائی تھی، جو کُولہے مٹکاتی برف پوش چوٹیوں سے فلرٹ کرتی تھی..اور یہ یقیناً ایک ورلڈ ریکارڈ تھا، بھلا آج تک کسی کوہ نورد نے سنولیک پر جا کر پتنگ بازی کی ہے..

ابھی پچھلے برس سلمان نے عبدہُو کے تعاون سے ماؤنٹ ایورسٹ کے بیس کیمپ تک کا ٹریک ترتیب دیا تھا..میرے قدیمی کوہ نورد ساتھی خان سلیم اور عامر کے ٹُو بھی اس مُہم میں شامل تھے لیکن دوستوں، گھر والوں اور ڈاکٹروں نے مُجھے بے حد ڈرایا کہ خدا کا خوف کرو..میرے دل میں وسوسے بوئے کہ اگر تمہیں اُس بلندی پر کُچھ ہو گیا..پھیپھڑے جواب دے گئے تو تمہیں واپس پاکستان لانے کے لیے تمہارے ساتھیوں کو کتنا تردّد کرنا پڑے گا اور میں بقول خان سلیم ڈھیری ڈھا گیا..انکاری ہو گیا..سلمان کو میری غیر موجودگی کا سب سے زیادہ رنج ہوا، البتہ اُس نے کالا پتھر کے ایورسٹ بیس کیمپ پر پہنچ کر ایک ٹی شرٹ کی نمائش کی جس پر لکھا تھا ''تارڑ ٹیم کے کوہ نورد ایورسٹ کے بیس کیمپ پر''

سلمان پیشے کے لحاظ سے ایک پٹرولیم انجینئر ہے اور ایک مدت سے ''ایسو آئل کمپنی'' کے ساتھ وابستہ ہے..اس دوران وہ اُن کے کسی فوڈ پروگرام کا انچارج ہوا تو اُس نے آسٹریلیا بھر میں انگوروں کی شراب کی تیاری کے مراحل، اقسام اور ذائقوں پر نہائت عالمانہ لیکچر ڈلیور کئے حالانکہ وہ تو زیادہ پک چکے انگور کھانے سے بھی پرہیز کرتا ہے کہ کہیں ان میں وہ عمل شروع نہ ہو گیا ہو جس کے نتیجے میں خمار جنم لینے لگتا ہے..اسی طور اُس نے آسٹریلیا کے خوراک اور گوشت فروخت کرنے والے اداروں کو قائل کر لیا کہ اگر آپ لوگ جانور حلال کر کے مارکیٹ کریں تو آپ کی آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے، آسٹریلیا میں آباد لاکھوں مُسلمان آپ کے

حلال گوشت کو خریدنا پسند کریں گے اور ایسا ہی ہوا..بقول اُس کے اب آسٹریلیا میں فروخت ہونے والے بیشتر برگر اور سٹیک کسی حد تک حلال ہوتے ہیں..

سلمان کے گھر میں بے شک مجھے آرام بہت تھا، پر ایک بے آرامی تھی..ایک پرابلم ہوگئی..اُس کے جُڑواں بیٹے احمد اور حسن دنیا بھر کے ''ٹونز'' کی مانند اِک دوجے کی ہو بہو تصویریں تھیں..میں اُن کے درمیان تخصیص نہ کر سکا..میں کسی ایک بچے کے سر پر تھپکی دے کر کہتا ''ہیلو احمد..گُڈ مارننگ'' تو وہ ناراض ہو کر کہتا..میں تو حَسن ہوں..اور جب میں اپنے تئیں بہت چھان پھٹک کر کے حَسن کے رخسار چُھو کر اُسے ''حَسن ہاؤ آر یُو'' کہتا تو وہ گھور کر کہتا ''دادا، میں احمد ہوں..''

بلکہ ایک روز وہ دونوں میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے اور اُن میں سے کسی ایک نے اپنی نشانی واضح کی کہ یہ جو میرے رخسار پر ہلکا سا نشان ہے تو میں حسن ہوں اور دوسرا احمد..چنانچہ میں اُنہیں مخاطب کرنے سے پیشتر غور سے دیکھتا کہ نشان کس کے رخسار پر ہے اور جب نشاندہی ہو جاتی تو پھر یاد نہ رہتا کہ یہ نشان احمد کے رخسار پر ہے یا حسن کے!سلمان کے گھر کا سب سے دل کش حصّہ وہ ڈھکا ہوا برآمدہ تھا جس میں آرام کُرسیاں پڑی تھیں، پُھول اور پودے سجے تھے اور وہ ایک خاصے وسیع لان پر کُھلتا تھا اور وہاں جو شجر سر بلند تھے اُن کے اندر مختلف پرندوں اور طوطوں کو چہکنے کی سہولت میسّر تھی..

میں ناشتے کے بعد دن کے پہلے سگرٹ کے لئے اس برآمدے میں آ بیٹھتا اور ہر کش کے ساتھ کسی نہ کسی پرندے کی کُوک سنائی دے جاتی..

ایک روز میں نے آسٹریلوی طوطوں کراکاٹو کا ایک غول اڑان میں دیکھا جو پچھواڑے میں درختوں کے ایک ذخیرے میں روپوش ہو گیا..

ایک سویر سلمان نے رات بھر بیدار رہ کر نہائت نفیس پائے تیار کئے، بہانہ میری آمد کا تھا، جن کے شوربے میں لبنانی نان ڈبوتے ہوئے میں لطف اندوز ہو رہا تھا کہ سمیر کا فون آ گیا ''ابا..کیا ہو رہا ہے؟''

''تم بعد میں فون کرنا اس وقت میں بہترین پائے ناشتے کے طور پر کھا رہا ہوں..''

''ابا..آپ سڈنی جا کر آپرا ہاؤس نہیں دیکھ رہے، بندرگاہ کا پُل نہیں دیکھ رہے، کسی کنگرو کو نہیں دیکھ رہے..پائے کھا رہے ہیں..یہ آپ کیا کر رہے ہیں، آپ کا کولسٹرول شُوٹ کر جائے گا..''

''کر جائے..''

''ویسے..کیسے ہیں؟''

''اعلےٰ..''

سلمان کی سٹڈی میں ایک شیلف پر میری تمام کتابیں سجی تھیں اور ان کے سوا وہاں اردو ادب کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات بھی نہائت ترتیب سے اُس کے ادبی ذوق کی گواہی دیتی تھیں..

آسٹریلیا ایسے وسیع ترین اور ویران زمینوں کی وسعت والے براعظم میں میں نے دنیا کے سب سے تنگ اور چھوٹے بیڈروم دیکھے..

ریحان علوی کا وہ بیڈرُوم جس میں ہم دونوں شب بھر ایک دوسرے پر گرتے پڑتے رہے..اُس ہسپانوی موٹل کا کمرہ جہاں ہم نے کُچھ روز بسر کیے اور یہاں بھی سلمان کے گھر میں بھی..بستر کے علاوہ کسی ایک کُرسی یا صوفے کی گنجائش نہ تھی..تنگیٔ داماں بہت تھی..اور یہ اُس برطانیہ کی ودیعت تھی جس کی سلطنت پر کبھی سُورج نہ ڈوبتا تھا لیکن اُن کے جزیرے میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ بیڈروم میں ایک صوفے یا کُرسی کی گنجائش بھی ہونی چاہئے..چنانچہ جب وہ آسٹریلیا میں وارد ہوئے تو یہاں بھی اُنہوں نے ایسے گھر تعمیر کیے جن میں اُن کے آبائی وطن کی تنگی اور مختصر پن تھا..شائد وہ ایسے چھوٹے چھوٹے بیڈرُوم میں ہی محسوس کرتے تھے کہ وہ اب بھی اپنے انگلستان میں ہیں..

سلمان کے گھر میں، میں نے ایک نہائت پاکیزہ اور مُصفّٰے زندگی بسر کی..

ایک شب ہم سڈنی کی بندرگاہ سے متصل علاقے ''راک'' میں محوخرام ہوئے..میں نے سلمان سے ایک شکوہ کیا تھا کہ جب سے میں سڈنی میں آیا ہوں، کاروں، لینڈ کروزرز میں قید اس شہر کو سرسری دیکھتا ہوں یا پھر گھروں اور ریستورانوں میں مقفّل کر دیا جاتا ہوں تو میں اس شہر کے فٹ پاتھوں پر پیدل چلنا چاہتا ہوں، بے مقصد فضول سی آوارہ گردی کرتا اُن فٹ پاتھوں پر چلتے لوگوں کی قُربت میں ہونا چاہتا ہوں چنانچہ ہم ''راک'' میں تھے..

ہم نے شام اُترنے سے پہلے بندرگاہ کے پُل کے سائے میں ایک مُسلمان شادی شدہ جوڑے کا فوٹوسیشن دیکھا جو ایک دوسرے کی جانب بُھوکی نظروں سے دیکھ رہے تھے..سنہری وائن کے گلاس تھامے لبنانی نژاد آسٹریلین تھے اور الحمدللہ مسلمان تھے..

دولہا میاں تو اچھی شکل کے تھے لیکن دُلہن اتنی فربہ تھی کہ وہ ویڈنگ ڈریس میں پُھولتی تھی پر سماتی نہ تھی..ہم نے اپنا تعارف کروا کے اُن کے ہمراہ کُچھ تصویریں اتروائیں..

''راک'' کا علاقہ دل نشیں اور قدامت کے رنگ میں..آرٹ گیلریوں اور نوادرات کی دکانوں سے دل کش ہوتا ایک ہلکی پھوار میں بھیگتا تھا..تو ہم بھی بھیگتے تھے..تب ہم نے بلجیم کی مشہور چاکلیٹ چین میں

نہائت دل افروز اور دل کو بے ایمان کر دینے والے ذائقوں کے چاکلیٹ کھائے، دنیا کی بہترین کافی سے لطف اندوز ہوئے..

اس شام کی رعنائی میں کچھ شک نہ تھا..رخساروں پر اترتی پھوار..بلجیم کے چاکلیٹ کیکوں کے...

اوہ..بہشتی ذائقوں اور گرم کافی کی مہک کو اپنے بدنوں میں محسوس کرتے اُس شام کی رعنائی میں کچھ شک نہ تھا..

سمندر کی تاریکی پر سڈنی آپرا ہاؤس کی عمارکی سفید تتلی پر پھیلائے پانیوں پر ٹھہری ہوئی تھی..

میں نے جب کبھی اس عمارت کو سرِشام دیکھا، ڈوبتے سورج میں دیکھا تو مجھے اپنے زمانوں کے گلوکار ہیری بیلافونٹے کا وہ گیت یاد آنے لگتا جو بیت چکے برسوں میں انگلستان کی ہر رقص گاہ اور مے خانے میں گونجتا تھا..

'' سُرخ بادبان، جب سورج غروب ہوتا ہے..

میں تمہیں ایک بہت آہستگی سے پانیوں پر رواں کشتی میں..

چین لے کر جاؤں گا..

اے سلوبوٹ ٹُو چائنا..''

تو میں نے سُرخ ہوتے بادبانوں کی ایک آہستگی سے پانیوں پر رواں کشتی میں کسے چین لے کر جانا تھا..کس کو؟

کسی کو بھی نہیں..سوائے اپنے تخیل اور واہموں سے وجود میں آنے والی کسی شکل کے..میں نے تنہا ہی اس سُرخ بادبانوں والی کشتی پر سفر کرنا تھا جس نے مجھے بالآخر تاریک سمندروں کے سُپرد کر دینا تھا..

○○○○○

''آسٹریلیا کے درمیان میں انانگولوگوں کی سرزمین پر ایک سُرخ چٹان کی جانب ہم پرواز کرتے تھے''

سلمان نے مُجھے آسٹریلیا دکھانے کے بہت گُڈ بندوبست کر رکھے تھے..

چونکہ وہ ایک اہم انتظامی عُہدے پر مامور تھا جہاں چھٹی کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اس لئے وہ ایک ہفتے کے لئے بیمار ہو گیا تھا..

''سڈنی سے صرف تین گھنٹے کی فضائی مسافت پر برزبین کے قریب آسٹریلیا کا معجزہ گریٹ بیرئر ریف واقع ہے.. ایئر اور ہوٹل بُکنگ ہو چکی ہے.. گریٹ بیرئر ریف کے سمندر شیشہ سمندر ہیں، اتنے شفاف ہیں کہ اُن کے اندر تیرتی آبی حیات، چٹانیں، جھاڑیاں، سمندری پھول، مچھلیاں، کیکڑے، شارک مچھلیاں یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے کسی شیشے کے شوکیس میں نمائش پر ہوں.. ہم وہاں سکوبا ڈائیونگ کریں گے.. ایک شیشے کی آبدوز میں سوار ہو کر سمندر کی تہہ میں اتر کر سمندری حیات کے حیرت انگیز مُعجزے اپنی قربت میں دیکھیں گے.. ہم وہاں تین روز قیام کریں گے اور پھر ہم آسٹریلیا کے سب سے بڑے عجوبے الورو راک کی جانب پرواز کر جائیں گے جو اس براعظم کے عین درمیان میں واقع ہے..''

لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت..

اُس شب جب ہم ''راک'' کے علاقے میں خوب چٹان نوردی کر کے، پھوار میں بھیگتے گھر لوٹے تو ٹیلی ویژن پر ایک پُرجوش، جھاگ بھرا سمندری طوفان غضب ناک ہو رہا تھا، مکانوں کی چھتیں پرندے ہو گئی تھیں، اڑتی پھرتی تھیں، شجر دوہرے ہو رہے تھے اور ساحلی قصبوں کے گلی کُوچوں میں کشتیاں چل رہی تھیں اور یہ سمندری طوفان گریٹ بیرئر ریف کے سمندروں کو ساحلوں پر اچھال رہا تھا.. وہاں تک جانے والی تمام پروازیں منسوخ کر دی گئی تھیں.. یعنی قدرت نے فیصلہ کر دیا تھا کہ تارڑ کو گریٹ بیرئر ریف تک جانے سے

روکنے کے لئے ایک طوفان کا خصوصی بندوبست کر دیا جائے.. چنانچہ یہ سفر مجبوراً موقوف کر دیا گیا بلکہ ہم نے شک کیا کہ اگر ہم ایک روز پیشتر وہاں چلے جاتے تو اس وقت اگر ہوٹل کی چھت سلامت رہتی تو ہم بالکونی میں کھڑے ہو کر طوفان کا نظارہ کرتے ایک پُرانا برطانوی گیت گا رہے ہوتے کہ..

واٹر واٹر ایوری وہیئر ..اینڈ ناٹ اے ڈراپ ٹُو ڈرنک..

اب سلمان نے اپنے سفری ایجنٹ سے کُچھ مذاکرات کئے کہ ہمیں سڈنی سے براہ راست آئلرز راک یا اولورو چٹان تک ہی بھیج دو.. یہ چٹان جو آسٹریلیا کی صحرائی وُسعتوں میں یقیناً کہیں آسمانوں سے گر کر براجمان ہو چکی تھی، اُس تک پہنچنے والے شیدائی بے شمار تھے، وہاں رہائش کے بندوبست محدود تھے کہ آسٹریلین حکومت اُس علاقے میں کم سے کم لوگوں کو دیکھنا چاہتی تھی تاکہ وہ اُس کے کنوارپن اور صحرائی حُسن کو اپنی موجودگی سے مجروح نہ کریں لیکن یہاں بھی سلمان کے مارکیٹنگ کے تجربے نے کام دکھایا اور نہ صرف ہماری ٹکٹیں کنفرم ہو گئیں بلکہ رہائش کے لئے ایک بنگلہ بھی مخصوص ہو گیا..

سڈنی سے جتنے بھی مسافر اُس پرواز میں سوار ہوئے، اُن سب کی منزل ایک ہی تھی، وہ اُس چٹان کے سحر میں مبتلا لوگ تھے جو آسمانوں سے گری تھی، اور بے انت صحرائی وُسعتوں کے درمیان میں براجمان ہو گئی تھی..

یاد رہے کہ اولُورو راک کے آس پاس ہزاروں کلومیٹر کی صحرائی ویرانیاں اور وحشت بھری بیابانیاں ہیں، نزدیک ترین انسانی آبادی ایلس سپرنگ ہے جو وہاں سے چار سو کلومیٹر کی دُوری پر واقع ایک ویران سا قصبہ ہے.. تو یُوں جانئے کہ ہم افریقہ کے صحرائے اعظم، ربع الخلیل یا تکلا مکان صحرا کے اندر کہیں اترنے کے لئے پرواز کرتے تھے، ایک نامعلوم کی جانب اڑے جاتے تھے..

آسٹریلیا کے ویرانوں کی سُرخ مٹی میں سے جب پہلی روئیدگی نے جنم لیا، پہلی نمود ظاہر ہوئی، پہلے بُوٹوں، گھاس، شجر اور جھاڑیوں نے سر اٹھایا تو اُسی لمحے زندگی نے جہاں چتکبرے سانپوں، گرگٹوں، چھپکلیوں، نیولوں اور کرلوں اور اُن ویرانوں پر اڑان کرنے والے پرندوں میں اپنی رُوح پھونکی تو ان سب کے ساتھ حضرت انسان بھی وجود میں آ گئے.. اور یہ انانگو لوگ تھے جو پچھلے کم از کم ساٹھ ہزار برس سے ان ویرانوں کی جنگلی حیات کے ساتھ حیات کرتے چلے آئے تھے.. بلکہ جنگلی حیات اور ان انانگو لوگوں میں کُچھ زیادہ فرق نہ تھا، اُن کی شکلیں اتنی طویل رفاقت کے بعد اُن جیسی ہی ہو گئی تھیں..

یہ لوگ ابورجنل کہلائے اور میرے علم و فضل کی وُسعت کی داد دیجئے کہ میں آج تک یہی سمجھتا رہا

کہ ابورجنل آسٹریلیا کے آبائی باشندوں کے قبیلے کا نام ہے جب کہ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ابورجنل کا مطلب ہے.. آسٹریلیا بورن اور جنل..ان سفید فاموں کی آمد تو ابھی کل کی بات تھی، یہ ابھی کچھ لمحے پیشتر آسٹریلیا کے ساحلوں پر اترے تھے جب کہ انانگو، اُنہی کی قدیم داستانوں کے مطابق اس سرزمین پر تب وجود میں آئے جس لمحے اولُو روچٹان آسمانوں سے اتری تھی..

جہاں امریکہ کے آبائی باشندے ریڈ انڈین ایک نہائت مہذب، بزرگوں کے طے شدہ آسمانی عقیدوں کے مطابق، ایک عظیم ثقافت کے امین، خوش شکل اور خوش بدن، اخلاقیات کے ارفع اصولوں کی پیروی کرنے والے باتوں میں شاعری کرنے والے..دنیا کے بہترین گھڑ سوار، تمباکو کے رسیا، اپنی آبائی سرزمین کے لئے سینہ سپر ہو جانے والے اور بالآخر جدید ہتھیاروں کے آگے سرنگوں ہو جانے والے لوگ تھے وہاں انانگو ایک نہائت ابتدائی زندگی گذارتے تھے، اُن کی شکلیں بھی جاذب نظر نہ تھیں، نہ اُن کے پاس ریڈ انڈینز کی مانند تیر کمان، برچھے اور ٹاماہاک کلہاڑے تھے، نہ گھوڑے تھے، لکڑی سے تراشے ہوئے ہتھیار اور نوکیلے پتھروں سے ساختہ نیزے تھے، وہ مدافعت نہ کر سکے..اُنہوں نے ایک مدت سفید فام لوگوں کو اپنے ان ابتدائی ہتھیاروں کی مدد سے اپنی سرزمین پر قدم نہ رکھنے دیا کہ اُنہیں بھی اپنے وطن پر اتنا ہی مان تھا جتنا کہ ریڈ انڈینز کو تھا.. پر وہ کہاں تک مقابلہ کرتے، ملیا میٹ کر دیئے گئے..اُن کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا اور اُنہیں کنگروؤں کی مانند تلف کر دیا گیا..ایک مدت تک، سینکڑوں برسوں تک وہ ذلتوں کے مارے لوگ رہے..چڑیا گھروں میں جانوروں سے اُن سے بہتر سلوک ہوتا تھا..

اور پھر وہ جو بدشکل قرار دیئے گئے تھے، اُن میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے اپنی شکل پر فخر کیا اور وہ 1936ء میں پیدا ہونے والا اور 1992ء میں مر جانے والا انانگو قوم پرست ایڈی مابو تھا، اُس نے انصاف کے سب دروں پر دستک دی، اپنے لوگوں اور اُن کے حقوق اور سرزمین کی بحالی کے لئے اپنے ابتدائی ہتھیار نہ اٹھائے ایک بے مثال قانونی جدوجہد کا آغاز کیا..گورے لوگوں کو کم از کم اتنی داد تو ضرور دیں کہ کسی سرزمین پر زبردستی قبضہ کرنے کے بعد جب وہ ایک نظام قائم کرتے ہیں تو اُس نظام کے تحت انصاف کے دروازے سب پر کھلے ہوتے ہیں..1992ء میں آسٹریلیا کی عدلیہ نے ایڈی مابو کیس کا فیصلہ اُس کے حق میں کر دیا جس کے تحت انانگو لوگوں سے زبردستی چھینی گئی زمینیں اُنہیں واپس کرنے کا حکم سنایا گیا..اُن کے حقوق کو تسلیم کیا گیا..

اسی طور ایک جینئس مصور البرٹ نماستہ جیرا نام کا تھا جو واٹر کلر میں اپنی سرزمین کے لوگوں، جانوروں اور درختوں کو پینٹ کرتا تھا..

دنیا بھر میں، خاص طور پر مغرب میں انصاف کی دیوی کی آنکھوں پر ایک پٹی بندھی ہوتی ہے، اُس

کے ہاتھ میں انصاف کا ترازو ہے جس کے دونوں پلڑے برابر ہیں..لیکن وہ سراسر اندھی بھی نہیں ہے گورا صاحبان کے مفادات کا دھیان رکھتے ہوئے اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی ذرا کھسکا کر دیکھ لیتی ہے کہ ترازو کے پلڑے کس جانب ذرا زیادہ جھکانے ہیں.. چنانچہ یہ دیوی انصاف کرتی ہے کہ ابھی کل جو گورا لوگوں کے بارہ جہاز آسٹریلیا کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے تھے اور وہ سب کے سب انگلستان کی جیلوں میں سڑتے ہوئے قاتل، ڈاکو، فراڈیئے اور حیا سوز مُجرم تھے وہ تو آسٹریلیا کے قانونی شہری تھے لیکن..اس سرزمین پر ساٹھ ہزار برس سے زندگی کرتے انانگو لوگ غیر قانونی تھے، شہریت اُنہی عطا نہیں کی جاسکتی تھی..وہ ایک مدت آسٹریلیا کی شہریت سے محروم رہے اور پھر مصوّر البرٹ نماستہ جیرا کی جدوجہد اور احتجاج کے نتیجے میں وہ اور اُس کی بیوی پہلے انانگو تھے جنہیں آسٹریلیا کا شہری تسلیم کیا گیا..یعنی اب وہ ووٹ دینے کے حقدار تھے، آئین اُن کے حقوق کی بھی حفاظت کرتا تھا، وہ کسی بھی ہوٹل میں داخل ہو سکتے تھے، کھانا کھا سکتے تھے اور ابھی تک ممانعت تھی، وہ اب اپنی ہی سرزمین پر اپنا گھر تعمیر کر سکتے تھے..اگرچہ مقولہ تو یہی ہے کہ انصاف میں تاخیر دراصل انصاف سے انکار ہے لیکن..

چونکہ ہم انانگو لوگوں کی آبائی سرزمین کی جانب پرواز کرتے تھے اس لیے..

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کہیے..اب بھی دلکش ہے ترا حُسن مگر کیا کہیے..

تو نظر اُدھر کو لوٹ گئی تھی..

ooooo

''یُولارا..اولورو چٹان کا بیس کیمپ..ایلس سپرنگ ساڑھے چار سو کلومیٹر''

ہم نامعلوم کی جانب سفر کر رہے تھے..

جب آپ جانتے ہیں کہ اس پرواز کے بعد منزل بیجنگ، نیو یارک، روم یا ٹورنٹو ہوگی تو آپ کے دل کے اندر اطمینان ہوتا ہے لیکن..اگر ایک سُرخ چٹان منزل ہو تو دل کو وسوسے گھیر لیتے ہیں، کیا صرف ایک چٹان کی خاطر سڈنی سے تین گھنٹے کا ہوائی سفر..جائز ہے..نامعلوم کے ویرانوں میں اتر جانا..صرف ایک چٹان کے لئے..دانش مندی ہے!

اس پرواز کے دوران جانے کیسے کیسے دریا، سمندر، جزیرے، جنگل اور دلدلیں گذرتی گئیں، سوائے انسانی آبادی کے ہر شے جو ویران اور تنہا تھی گذرتی گئی، بالآخر جہاز کسی آبادی میں نہیں ایک لق ودق سُرخ مٹی کے ویرانے میں لینڈ کر گیا..

کھڑکی کا شیشہ باہر کی حدّت سے سلگنے لگا اور لینڈ کرتے ہوئے بہت دور ایک سُرخ جھریوں بھری چٹان کا شائبہ سا ہوا اور پھر اوجھل ہو گیا..

''انانگو روائت کے مطابق اولورو چٹان اور اُس سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع کاٹا ٹُوٹا چٹانوں کا سُرخ انبار..محض چٹانیں نہیں ہیں، ایک زندہ وجود ہے..حیات کی نمود انہی چٹانوں میں سے ہوئی کہ وہاں اُن کی سُرخ پتھروں پر نشانیاں ہیں..''

ہم جہاز سے باہر آئے، صحرا کے گرم سانس شفاف اور بدن میں اتر کر اُسے حدّت دینے والے

روح کو تسکین دینے والے سانس تھے..

ایک مختصر سا ایئر پورٹ تھا جس پر سُرخ صحرا اُمڈتا چلا آتا تھا، ایئر سٹرپ کے قریب آ کر تھم جاتا تھا.. یہ ''پالیا ٹورسٹ ریسارٹ'' کا مختصر گھریلو سا ایئر پورٹ تھا جہاں دن بھر میں صرف دو پروازیں اترتی تھیں اور دو ہی شہری آسودگی کی جانب لوٹ جاتی تھیں..

''دیکھو یہاں کا آسمان کتنا نیلا ہے..'' مُونا کی آنکھوں میں اُس کی نیلاہٹ تصویر ہونے لگی.. ہم اس دنیا کی تمام تر کثافت اور آلودگی تین گھنٹے کی فضائی مسافت پر چھوڑ آئے تھے اور یہاں ابھی آسمان آلودہ نہ ہوا تھا، اُسی رنگت کا جُوں کا تُوں تھا جب یہ لمحہ تخلیق میں وجود میں آیا تھا..

ایئر پورٹ کے باہر لگژری کوچیں منتظر تھیں، جو ہمیں یُولارا لے جانے والی تھیں..

یہ یُولارا کیا ہے..

صحرا کے درمیان، ایک نخلستان.. سیاحوں کے لئے ایک آسائش بھرا مختصر قصبہ.. جس کے آس پاس سوائے ویرانیوں کے اور کُچھ نہ تھا، نزدیک ترین انسانی آبادی جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں چار سو کلو میٹر دور ایلس سپرنگ تھی اور اس یُولارا کے ناسُور کو صحرا اور بیاباں برداشت تو نہ کرتے تھے، اُمڈے چلے آتے تھے، بنگلوں، رہائش گاہوں کے پچھواڑے میں اپنی ویرانی مسلسل کاشت کرتے، اُنہیں ویران کر دینے کی مسلسل سعی کرتے تھے.. ہفتے میں دو مرتبہ 1663 کلو میٹر دور ایڈلائڈ کے شہر سے ایک کارگو ٹرین روانہ ہوتی تھی، سٹورٹ اور لیسٹر ہائی وے پر سفر کرتے ٹرک کنٹینر یہاں پہنچتے تھے.. ہر برس تقریباً ایک لاکھ لٹر دودھ، ساڑھے تین لاکھ انڈے، دو کروڑ ٹائلٹ پیپر، ہزاروں تربوز، ہزاروں من گوشت، سبزیاں، شراب کی بوتلیں، ملبوسات اور ان میں زنانہ زیر جامہ بھی شامل تھے یہاں.. یُولارا کے قصبے میں ٹرانسپورٹ کئے جاتے تھے..

اس یُولارا ریسارٹ کے ہوٹلوں، ریستورانوں اور دیگر انتظامی معاملات کے لئے آٹھ سو لوگ یہاں ملازم تھے اور ظاہر ہے یہاں کے نہیں تھے، سڈنی، ملبورن یا برزبین وغیرہ سے آئے تھے، لیکن کیوں؟ بھرے پُرے پُر آسائش شہر چھوڑ کر اس بیاباں میں کیوں چلے آئے تھے.. ایک شوقِ مُہم جُوئی کی خاطر.. دور دراز کے ویران صحراؤں میں زندگی کے کُچھ دن گذارنے کا رومان تھا جو اُنہیں باندھ کر یہاں لے آیا تھا.. مثلاً اگر آپ کسی بڑے شہر کے ایک ریستوران میں منیجر ہیں، ویٹر ہیں.. کسی سٹور یا دفتر میں ملازمت کرتے ہیں، کُچھ بھی کرتے ہیں تو ایسا سب کُچھ تو سبھی کرتے ہیں.. لیکن اگر آپ آئندہ حیات میں کہتے ہیں کہ..

''میں ٹمبکٹو کے ایک ریستوران میں ویٹر ہوا کرتا تھا..''

''میں گلابی شہر پیٹرا کے کھنڈروں میں مشروبات کے ایک کھوکھے میں کام کرتا تھا..''

میرے پاس ایک اونٹ تھا اور میں سیاحوں کو اہرام مصر کے گرد پھیرے لگواتا تھا..''

''میں تاج محل کے باہر سووینئرز فروخت کیا کرتا تھا..''

''صحرائے تکلا مکان کے کناروں پر موسمی پھل فروخت کیا کرتا تھا..''

''تبت کے شہر لاہسا میں سیاحوں کو کرائے پر سائیکلیں مہیا کرتا تھا..''

''وادیٔ ہنزہ کے ایک سکول میں انگریزی پڑھایا کرتا تھا..''

تو کیا یہ ایک کارآمد، مُہم جویانہ حیات نہ ہوگی، جو دوسروں سے الگ ایک حیرت بھری حیات ہوگی..

اسی طور یہاں یُولارا میں جو لوگ شہر ترک کر کے عارضی طور پر آ بسے تھے، اُنہوں نے بھی آئندہ زندگی میں فخر کرنا تھا کہ میں کبھی الورواک کے نزدیک یُولارا نام کے قصبے میں اُس کے واحد سٹور کا واحد کیشیئر تھا.. یا میں ہر صُبح سیاحوں کو ایک کوچ میں بٹھا کر الورواک پر سورج ابھرنے کا منظر دکھانے لے جایا کرتا تھا..

ہم جس سُرخ صحرا میں سے گذر رہے تھے یہ صحرا ویران تو نہ تھا..

حالیہ بارشوں نے صحرا کے پتّے پتّے بُوٹے بُوٹے کو.. گھاس اور جھاڑیوں کو نکھار دیا تھا.. یوں لگتا تھا جیسے مریخ کی سُرخ مٹّی میں سے ابھی ابھی گھاس پُھوٹی ہے، نومولودگی کی ہریاول گیلی نظر آتی تھی.. کسی باغبان نے پودوں، بُوٹوں اور سرکنڈوں کو ابھی ابھی بویا ہے..

اور جو آسمان تھا.. اُس کی سُتھری، بے عیب شیشہ نیلاہٹ کا کیا بیان ہو.. نیلے کانچ کا کٹورا ہم پر اوندھا پڑا تھا..

دراصل یہ دراصل صحرا نہ تھا.. نہ ریت کے ٹیلے تھے اور نہ فضا میں ریت کے ذرّے سلگتے تھے، دراصل یہ ایک گوبی تھا.. ایغور زبان میں گوبی کا مطلب ویرانہ ہوتا ہے، جہاں کوئی آبادی نہ ہو.. البتہ اس ویرانے میں بارشوں کی وجہ سے کیسی سرسبز ہریاول بھری بہار آئی ہوئی تھی..

سڑک کے کنارے پر ایک بورڈ نظر آیا..

یُولارا.... آٹھ کلومیٹر

اولورو چٹان.... بیس کلومیٹر

کاٹا ٹوٹا چٹانیں.. ترپن کلومیٹر

ایلس سپرنگ...ساڑھے چار سو کلومیٹر

آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ کتنا ہوتا ہے، ہم اگلے لمحے یُولارا میں تھے..اور وہاں سڈنی آپرا ہاؤس کی طرز کے سفید بادبان نیلے آسمان میں اٹھتے تھے.. یہاں ہمیں یُولارا کے جغرافیے اور سہولتوں سے آگاہ کیا گیا، نقشے مہیا کئے گئے..بتایا گیا کہ یہاں ایک سٹی سنٹر ہے جس کے گرد ریستوران، کافی ہاؤس، سوونیئر شاپس اور ایک گروسری سٹور ہے..فی الحال آپ اپنے بنگلے میں جا کر تھکن اُتاریئے..البتہ پچھلے پہر سٹی سنٹر سے ملحقہ لان میں انانگولوگوں کا لوک رقص ہوگا جسے آپ بغیر ٹکٹ کے دیکھ سکتے ہیں..

ہم جب ای ایم یُو واک اپارٹمنٹ کے 32 نمبر اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اور ایک بوڑھا ابورجنل ہمارے سُوٹ کیس ایک ٹرالی پر لادے ہمارے پیچھے چلا آتا تھا تو رہائش گاہ کی آسائش اور ٹھنڈک نے ہمیں یکدم افیونی سا کر دیا..ہم جیسے یونانی دیومالا کے افیون کھانے والوں کے ایک جزیرے میں آ گئے ہوں..سُست ہو گئے..

دو بیڈ روم، لِونگ رُوم اور ایک وسیع کچن جہاں کھانے پینے کے ہر نوعیت کے جدید آلات موجود تھے..

سائڈ ٹیبل پر انتظامیہ کی جانب سے کسی پیٹر وہائٹ کا ایک خوش آمدیدی خط پڑا تھا..آپ کی آمد کا شکریہ وغیرہ اور..

براہ کرم یہ احساس کیجئے گا کہ آپ کسی تہذیب یافتہ شہری آبادی میں قیام نہیں کر رہے..یہ پچھلے ساٹھ ہزار برس سے ایک بے آباد جگہ ہے..اگر آپ کے قالین یا بستر کی چادر پر کوئی اجنبی شکل کا کیڑا مکوڑا یا خوفناک سا کچھ رینگ رہا ہو تو ہراساں نہ ہو جایئے، البتہ سیاہ رنگ کا بہت سے پاؤں والا کوئی مکوڑا نظر آئے تو اُسے چھونے سے گریز کریں اور فوری طور پر انتظامیہ کو اطلاع کیجئے..کھڑکیوں کے شیشے سختی سے بند رکھئے..

آپ کی آمد کا شکریہ!

لِونگ روم کی وسیع شیشہ دیوار کھڑکی کے باہر ایک برآمدہ تھا اور وہاں ایک سفید برچ ٹیڑھی میڑھی حالت میں پڑا تھا..ایک گھنی صحرائی جھاڑی تھی جس کے اندر یقیناً وہی سیاہ رنگ کے مکوڑوں کے کئی خاندان آباد تھے..

میں ناشتے کے بعد سگرٹ پینے کی خاطر برآمدے میں آ بیٹھتا تو اُس جھاڑی پر کڑی نظر رکھتا..

برآمدے سے پرے صحرا کا ہول دُھوپ میں تھا..ہم ایک پُر آسائش پناہ گاہ میں اُس کی بیابانی سے پناہ مانگتے تھے..

اب یہ جو بیابانوں میں آسائشیں مُہیا ہو جاتی ہیں یہ آپ کے شوق آوارگی کے لئے بے حد مُضر ثابت ہوتی ہیں، آپ ان کی آسودگی میں استراحت فرماتے بُھول جاتے ہیں کہ آپ یہاں اونگھنے نہیں آئے،

جن مناظر کو دیکھنے کی خاطر اتنے فاصلے طے کر کے آئے ہیں اُنہیں فراموش کرنے لگتے ہیں اور ایئر کنڈیشنگ کی ٹھنڈک اور گدیلے بستر پر دراز ہو کر آنکھیں مخمور کر کے یہی کہتے ہیں کہ.. نہ چھیڑ ملنگاں نُوں.. اس سے پیشتر کہ میں گہری اونگھ میں جھول جاتا میں نے اپنے آپ پر جبر کیا اور نیند میں تقریباً جھولتی مُونا کو بیدار کیا.. ''مُونا.. ابھی ہم باہر جائیں گے.. صحرا کے سانس محسوس کریں گے، اُن ہواؤں میں سانس لیں گے جن میں لاکھوں برسوں سے انانگولوگ سانس لیتے رہے ہیں، چلی آؤ..''

''تم چلے جاؤ..'' وہ کروٹ بدل کر پھر سے نیند میں ڈبکی لگانے والی تھی جب میں نے کہا ''مُونا.. ہم دوبارہ تو یہاں نہیں آئیں گے..''

''کہاں نہیں آئیں گے؟''

''یہاں.. آسٹریلیا کے ان ویرانوں میں، پھر کہاں آئیں گے..''

''ہاں..'' وہ نیند بے باہر آ گئی ''پھر تو نہیں آئیں گے..''

وہ ٹورسٹ قصبہ یُولارا نام کا، بے شک جدید سہولتوں سے آراستہ تھا لیکن تھا تو ویرانوں کے ایک ویرانے میں پوشیدہ.. جدید سہولتوں نے اُس کے موسم تو نہ بدلے تھے، اُس کی ہوا کے کھرے پن پر تو اثر انداز نہ ہوئی تھیں.. تو وہ مختلف تھا.. اور وہاں آوارہ بھیڑوں کی مانند ہم جیسے سیاح گھومتے پھرتے تھے..

ہم سٹی سنٹر پہنچے تو قدرے مسکرائے.... یہ ایسے ہی تھا جیسے فٹ پاتھ پر ایک کُرسی میز ڈالے حجام ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں کر لے جس پر ''پیرس ہیئر کٹنگ سیلون'' لکھا ہو.. وہاں بادبانوں کی چھاؤں میں ایک مختصر تالاب تھا اور اس کے اردگرد ریستوران، کافی شاپس، آرٹ گیلریز، ایک بیوٹی پارلر، سوونیئر شاپس اور قصبے کا واحد گروسری سٹور تھا جہاں سے میں نے اپنا پسندیدہ سٹرابیری کے ذائقے والا دودھ، خالص دُودھ اور جُوس وغیرہ خریدے بلکہ سلمان نے خریدے جنہیں بعد میں میں نے اپنے بنگلے کے کچن کے فریج میں محفوظ کر لیا..

ہم نے اپنے بچّوں کے بچّوں کے لئے کُچھ ٹی شرٹس وغیرہ خریدیں کہ اس عُمر میں آ کر اپنے بچّے یاد نہیں رہتے اُن کے بچّے یاد رہتے ہیں، خاص طور پر ابراہیم کے لئے ایک ایسی ٹی شرٹ خریدی جس پر کیڑے مکوڑے اور چھپکلیاں وغیرہ نقش تھیں کہ ابراہیم جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں نہ صرف جانوروں کا بلکہ ہر نوعیت کے حشرات الارض کا شیدائی ہو چکا تھا اور اُسے ہر کیڑے مکوڑے کا خاندانی شجرہ نسب زبانی یاد تھا..

دوپہر کے کھانے کے لئے ہم ''گیکو کیفے'' گئے..

اور ہم تو نہیں جانتے تھے کہ ''گیکو'' اولورو چٹان کے ویرانوں میں رینگنے والی ایک رنگین چھپکلی کو

کہتے ہیں جسے اہل آسٹریلیا عزیز از جان جانتے ہیں یہاں تک کہ ان ویرانوں میں سڑکوں کے کنارے آویزاں بورڈ ہیں جن پر اس چھپکلی کی تصویر تلے ایک عبارت درج ہوتی ہے کہ خبردار..احتیاط کیجئے سڑک پر سے اگر کوئی گیکو چھپکلی گذر رہی ہو تو اُسے کچل نہ دیجئے گا..خبردار!

کم از کم میری چھوٹی بہو طیبہ تو ادھر آنے والی نہیں تھی..وہ تو کسی دیوار پر چھپکلی کے ایک بچے کو رینگتا ہوا دیکھ لے تو نزدیک ترین کُرسی پر چڑھ کر رنگ زرد کرتی کانپنے لگتی ہے اور جب تک سُمیرا اپنی ایئر گن سے اُس چھپکلی بچے کو ہلاک نہیں کر ڈالتا وہ کُرسی سے نیچے قدم نہیں دھرتی..

بہر طور ''گیکو کیفے'' میں فِش اینڈ چپس کھاتے ہوئے خدشہ سا رہا کہ کہیں میں گیکو اور چپس تو نہیں کھا رہا..

''گیکو کیفے'' کے شیشے کی کھڑکیوں کے باہر صحرا تھا جو اُمڈتا ہوا آتا تھا..

oooooo

''ابورجنل رقاص اور ایک ابورجنل بچّہ..کون ہو تم، جو ہماری ہزاروں برس کی تنہائی میں مُخل ہو گئے ہو''

مُجھے شک ہے کہ ٹاؤن سنٹر کے برابر میں جو ایک گھاس بھرا مختصر میدان تھا جس میں صحرائی شجر سایہ دار ہوتے تھے وہاں ہم معصوم سیّاح بھیڑوں کے لئے، انانگو قدیم رقص پیش کرنے والے پانچ حضرات، جانگیوں میں ملبوس، بدن پر سفید دھاریاں پینٹ کئے، سروں پر کلغیاں باندھے، ہاتھوں میں انانگو شکار کرنے والے لکڑی کے ہتھیار لئے..وہ سب انانگو نہ تھے..اُن میں کُچھ بہروپئے، سفید فام تھے..بلکہ اُن میں سے ایک تو اتنا فربہ تھا کہ وہ کسی کنگرو تو کیا، کسی اوندھے پڑے کچھوے کو بھی شکار نہ کر سکتا تھا..

وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں کہ..یہ نام سُن کر ذہن میں ایک گھنٹی بجتی ہے کہ یہ پہلے کہیں سُنا ہوا ہے..تو اسی طور یولارا کا نام سُن کر ذہن میں ایک گھنٹی سی بجتی تھی، یہ آشنا سا لگتا تھا، ماضی کی گپھاؤں میں فراموش کردہ ایک مدھر گیت کی صُورت یادداشت میں گنگناتا تھا..پھر میں نے اس آشنائی کا بھید پالیا..بس وہی بیت چکے زمانے جب ہر بطخ راج ہنس دکھائی دیتی تھی اُن دنوں کی دُھند میں ڈین مارٹن کی جنسی آواز میں ایک اطالوی لوک گیت ''وُلارے'' جب روشنیاں مدھم پڑتی تھیں تو کانوں میں سرگوشیاں کرتا تھا..

وُلارے..ہوہوہو..کم تارے..ہوہو..

ہم سب جب یہ گیت چھڑتا تو ڈین مارٹن کی صدا ''وُلارے'' کی سنگت میں ..ہوہوہو..کرنے لگتے..

تو یہی قدیم آشنائی آشکار ہوئی.. یولارا..دُلارے..ہوہوہو..

ہاں..اُن میں کُچھ بہروپئے تھے..سفید فام تھے..

ابورجنل کا رُوپ دھارے ہوئے تھے..

مُجھے شک ہے کہ ابورجنل لوگ صرف سیاّحوں کومحظوظ کرنے کی خاطر.. پیسے کے لئے اپنے آبائی رقص پیش کرنے سے اجتناب کرتے ہیں اس لئے گورالوگوں کو پینٹ کر کے اُنہیں ابورجنل کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا..

اس ساٹھ ہزار پُرانے قبائلی رقص کو دیکھنے کے لئے اس ریسورٹ کے عارضی آباد کار یعنی سیاّح حضرات اپنے خاندانوں سمیت گھاس پر چوکڑیاں مارے بیٹھے تھے اور اُن کے سامنے مٹّی سے لیپا ہوا ایک سٹیج تھا جس پر پانچ ننگ دھڑنگ حضرات دھم سے داخل ہوئے.. پہلے تو اُنہوں نے خوب ہاہا کار مچائی، دُھول اڑائی اور پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر اس رقص کا پس منظر بیان کیا..

انانگو نوجوان شکار کے لئے نکلے ہیں چوکنّے ہاتھوں میں لکڑی کے نیزے تھے، وہ ناک اٹھا کر شکار کی بُو سونگھتے ہیں..کبھی یکدم ساکت ہو جاتے ہیں اور کبھی زمین کو سُونگھتے ہوئے ہاؤ ہاؤ کرنے لگتے ہیں..

یا پھر وہ صحرا میں چل رہے ہیں اور اُن کے سامنے ایک سیاہ سانپ رینگتا سرکتا آ جاتا ہے، سانپ کے سیاہ بدن پر سفید نُقطوں کی آرائش ہے اور وہ اُسے گزند نہیں پہنچاتے..اُس سے بچ کر نکل جاتے ہیں کہ وہ بھی تو تب سے ان ویرانوں میں تھا جب سے انانگو لوگ تھے..

اور ہاں میں یہاں انانگو قدیم مصوّری کے حیرت ناک، دل کش اور رنگ رنگ کے نقشوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں..بیشتر تصویروں میں بنیادی ڈیزائن سیاہ سانپ کے بدن پر پائے جانے والے سفید دھبّوں کا ہے جن کی ترتیب ایسی ہے جیسے کسی ماہر مصوّر نے اُنہیں پینٹ کیا ہو..ان تصویروں میں مگرمچھ، گرگٹ اور چھپکلیاں نہائت جدید شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں..اسی لان کے کناروں پر انانگو مصوّری کی آرٹ گیلری تھی جہاں فرش پر براجمان دو ابورجنل عورتیں انتہائی انہماک سے کینوس پر تصویریں بناتی تھیں..سانپ کے چتکبرے پن کو مصوّر کرتی تھیں لیکن خود تصویر اتروانے سے اجتناب کرتی تھیں..

میں نے اکثر ابورجنل لوگوں کو تہذیب کے ابتدائی مراحل میں بیان کیا ہے، اُن کا رہن سہن، خوراک، ہتھیار سب کے سب معمولی اور ابتدائی ہیں لیکن اُلجھن یہ ہے کہ اس کے باوجود اُن کی مصوّری، رنگوں

کا چناؤ اور عنوان ایک زرخیز ترین تخلیقی دماغ کی نشاندہی کرتے ہیں.. یہ کیسے ہو گیا کہ اُن کی حیات، صحرا میں رینگنے والے حشرات الارض اور دیگر جانوروں کی ہم سطح رہی اور اُن کا دماغ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا تخلیق کی بلند ترین سطح تک پہنچ گیا..

شائد اسی لئے آسٹریلیا کی شہریت حاصل کرنے والا پہلا ابورجنل شخص ایک مصور تھا..

کبھی ڈنڈے بجاتے ہوئے، کبھی بندروں کی مانند کُودتے ہوئے، کبھی رُوحوں کو ڈراتے ہوئے..

اُن پانچ رقاص حضرات نے خوب دُھول اڑائی اور پھر حاضرین کو دعوت دی کہ وہ سٹیج پر آ کر اُن کی ہاؤ ہو اور اچھل کُود میں شامل ہو جائیں اور حاضرین تو گویا اسی انتظار میں تھے وہ بھی اپنے تئیں انانگو رقص کرنے لگے اور ان میں خدا جھوٹ کیوں بلوائے، ایک نوے برس کی بڑھیا تھی جو سب سے زیادہ پُرجوش ہوئی جاتی تھی یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب اُس نے ''ہاؤ'' کا نعرہ لگایا تو اُس کی بتیسی قدرے ڈھیلی ہو کر کھسک گئی اور اُس نے فوراً جبڑے کو ہلا جلا کر اُسے پھر سے اپنی جگہ پر مستحکم کر لیا..

بے شک یہ ایک بہروپ اور سیاحوں کو مزید اُلو بنانے کا ایک نسخہ تھا لیکن اس کے باوجود یہ انانگو رقص اس لئے یادگار تھا کہ آسٹریلیا کے ویرانوں کے درمیان وہاں کے آبائی باشندوں کے مزاج کی عکاسی کرتا تھا..

یہ پانچوں رقاص اگر لاہور کے جناح باغ میں اس نوعیت کا دھما چوکڑی رقص پیش کر رہے ہوتے تو لاہوریئے اُنہیں دیکھ کر'' پاگل ای اوئے'' کے نعرے لگاتے..

آج شب ہم نے ''خاموشی کی آوازیں'' نام کے ڈنر میں شریک ہونا تھا.. صحرا کے سناٹے میں سے ابھرنے والی آوازوں پر کان دھرنے تھے، اولورو چٹان کو ڈوبتے سورج میں ڈوبتے دیکھنا تھا لیکن ابھی تو پچھلے پہر کی دھوپ تھی جوان ویرانیوں میں اپنی حدّت کے برچھے تیز کرتی تھی.. ہم ابورجنل رقص کا تماشہ دیکھنے کے بعد کُچھ دیر انانگو آرٹ گیلری کے فرش پر پھسکڑا مارے دوفربہ ابورجنل مصور خواتین کو کینوس پر جُھکے اُس پر چتکبرے سانپ نقش کرتے دیکھتے رہے اور پھر ایک یخ بستہ منرل واٹر کی بوتل کے حصول کی خاطر سٹی سنٹر کی جانب چلنے لگے..

اور تب وہ آئے..

اس سرزمین کے حقیقی وارث، ناراض شکلوں والے، ہمیں ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے کہ ہم غیر ملکی حملہ آور تھے جو اُن کی سرزمین پر قابض ہو گئے تھے..

وُلارا کی صحرائی بستی میں تارکول کی نفیس سڑک پر ایک نفیس کوچ آ ٹھہری..گمان یہی تھا کہ اُس میں سے کُچھ مزید سیاح برآمد ہوں گے لیکن اُس میں جتنے بھی مسافر تھے، وہ سب انانگو تھے.. ابورجنل لوگ تھے، وہ اترے..اور اُنہوں نے متوجہ ہوتے سیاحوں کی موجودگی کو حقارت سے دیکھا، اُن کے چہرے بغیر کسی تاثر کے سپاٹ تھے..کسی ایک چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی.. یہاں تک کہ اگر کسی سیاح نے اپنے کیمرے کا رُخ اُن کی جانب کیا تو اُنہوں نے ناگواری سے مُنہ پھیر لیا.. پورے خاندان تھے، بچے بھی کثیر تعداد میں موجود تھے، بوڑھے کم تھے، نوجوان خواتین بھی وسیع تن وتوش کی مالک تھیں، بھورے بال، چھوٹی آنکھیں اور تیوریاں چڑھی ہوئیں، وہ کوچ سے اترے اور سٹی سنٹر کے راستے پر ایک ہجوم کی صورت چلنے لگے...وہ اپنی روزمرہ کی ضروریات کے حصول کی خاطر یہاں چلے آئے تھے..

کسی نے خبر کی وُلارا کے ریسورٹ سے کُچھ دور صحرا میں ان لوگوں کی ایک بستی ہے جہاں وہ اپنی پسند کی حیات کرتے ہیں، بے شک کوشش تو ہوئی ہوگی کہ یہاں آنے والے سیاحوں کو انسانوں کا یہ ''چڑیا گھر'' دکھایا جائے لیکن انانگو کی انا بہت مضبوط اور توانا ہے، وہ اپنی بستی میں کسی اجنبی کو خوش آمدید نہیں کہتے..انکاری ہو جاتے ہیں..روزانہ حکومت کی جانب سے اُنہیں ایک کوچ مُہیا کی جاتی ہے جس میں سوار ہو کر وہ وُلارا آ جاتے ہیں، گھومتے پھرتے ہیں، کسی سے کلام نہیں کرتے، شاپنگ کرتے ہیں، خوراک اور وودھ اور شراب خریدتے ہیں، بچے آئس کریم کھاتے ہیں..لڑکیاں تازہ ترین پاپ موسیقی کی سی ڈیز خریدتی ہیں، مصوری کا سامان حاصل کرتے ہیں اور کسی سے نظر ملائے بغیر کوچ میں سوار ہو کر اپنی تنہائی میں چلے جاتے ہیں..

اُن میں سے بیشتر ننگے پاؤں تھے..آنکھوں میں وحشت اور آپ کے لئے ناپسندیدگی اور ہم اُنہیں مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے..ہم جانے کن جہانوں سے آخر کیوں اُن کے جہان میں آ گئے تھے..اُن کی قدیم حیات کے کارخانے میں خلل ڈال دیا تھا..جیسے ہم کسی میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے شوکیسوں میں سجے قدیم وحشیوں کے مجسموں کو دیکھتے ہیں، ویسے دیکھتے تھے..

کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ میں آج سے ساٹھ برس قبل انہی ابورجنل لوگوں سے متعارف ہوا تھا..اسی لئے میں ان کی پہچان رکھتا تھا کہ میں نے انہیں دیکھا ہوا تھا..

اُن زمانوں میں ایک حیرت انگیز ایجاد ہوئی تھی، کوڈک کمپنی نے کسی حد تک ہمارے ہاں جو بائی سکوپ ہوا کرتا تھا جس میں آنکھ لگا کر تاج محل اور بارہ من کی دھوبن دیکھا کرتے تھے اُس کی ایک جدید شکل ایجاد کی تھی..ایک ''ویو فائنڈر'' متعارف کروایا تھا جس میں ایک گتے کا ایک کارڈ جس میں پلاسٹک کی جڑواں

تصویریں نصب ہوتی تھیں، داخل کر کے اُسے آنکھوں سے لگا کر لیور دبایا جاتا تھا تو وہ تصویریں آج کی تھری ڈی تکنیک کی صورت میں اتنی زندہ اور قریب لگتی تھیں کہ آپ کسی ایک تصویر کے پس منظر میں ایک جھاڑی پر کھلے پھولوں کی مہک محسوس کر سکتے تھے..

میرے ابا جی نے جو ہرنئی ایجاد پر نہائت پُرجوش ہو جاتے تھے مال روڈ کے زیدی فوٹو گرافر کی دکان سے مجھے کوڈک کا یہی ویوفائنڈر خرید کر کسی عید پر تحفے میں دیا، اس کے ہمراہ دو گول کارڈ بھی تھے..ایک تاج محل کے منظروں کا تھا اور دوسرا آسٹریلیا کے ابورجنل باشندوں کی حیات کی عکاسی کرتا تھا.. میں پہروں ویوفائنڈر پر آنکھیں جمائے آسٹریلیا کے ان باشندوں کے شب و روز کو غور سے دیکھتا رہتا..عجیب مخلوق تھی.. کبھی ایک ننگ دھڑنگ سیاہ رنگت بُھورے بالوں والا شخص شکار کے لئے نیزہ تانے چوکنا کھڑا ہے..کہیں وہ لوگ ایک سانڈھے کو آگ پر بُھون رہے ہیں..اور اُن کے عقب میں ایک سُرخ چٹان ہے..

تو اُس کوچ میں سے برآمد ہونے والے وہ لوگ سب کے سب میرے دیکھے ہوئے تھے..آج سے ساٹھ برس پیشتر میں ان سے متعارف ہو چکا تھا..

سٹی سنٹر کی جانب بڑھنے والے ابورجنل خاندانوں میں ایک بچہ تھا اور کسی نے مجھے پلٹ کر نہ دیکھا لیکن ننگے پاؤں، بُھورے بدرنگ بالوں والا وہ بچہ تھا جو مجھے دیکھتا تھا، شائد اس لئے کہ سیاحوں کے اُس ہجوم میں، میں واحد شخص تھا جس کا رنگ اُس کی رنگت کے قریب ہوتا تھا..

اور وہ پلٹ کر بار بار مجھے شائد اس لئے دیکھتا تھا کہ پُوچھے ''تم ان سب گورے لوگوں میں واحد شخص ہو جو مجھ ایسے دکھائی دیتے ہو تو کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟'' اُس کی نظروں میں شکائتیں تھیں..

جیسے میں نے ''الاسکا ہائی وے'' میں ٹیلر روڈ کی خوبصورتی بیان کرنے کے لئے اپنے تئیں امراؤ القیس کا انداز اختیار کیا..''اے غزال شب'' میں کرشن اور ارجن کے درمیان مکالمے میں نے ''گیتا'' کا اسلوب خود تخلیق کرنے کی کاوش کی تو ایسے ہی وہ ابورجنل..انانگو بچہ جس کی آنکھوں میں وحشت کے سوا کچھ شکائتیں تھیں میں اُنہیں حرفوں میں ڈھالنے کی بے شک ناکام سعی کرتا ہوں..

''کون ہو تم، جو ہماری ساٹھ ہزار برس کی تنہائی میں،
مُخل ہو گئے ہو..
ہم نے تمہیں کوئی سندیسہ تو نہیں بھیجا تھا کہ..

ہمارے ساحلوں پر آ اترو..
اترتے ہی ہمارے درختوں کے سینے چاک کر کے،
اُنہیں مُردہ کر دو..
ہم تو کسی چھپکلی کو بھی اتنی بیدردی سے نہیں مارتے،
جیسے تم نے ہمیں، ہمارے بچّوں کو ہلاک کیا..
کون ہو تم؟
جو ہماری آبائی زمینوں پر قابض ہو گئے..
ہم اس سرزمین کے قدیم چراغ تھے..
تم نے ہمیں بجھا دیا..
تمہارے ہتھیار لوہے کے تھے، آگ اُگلتے تھے..
ہمارے پاس لکڑی کے ہتھیار تھے..
تم نے ہمیں ملیامیٹ کر دیا..
ہمارے بچّے اٹھا کر لے گئے..
ماؤں کی گود کو خالی کر دیا..
تہذیب کے نام پر اُن میں سے بہتوں کو غلام بنا لیا..
کُچھ کو عیسائیت کی صلیب پر چڑھا دیا..
کون ہو تم لوگ..
اور اب معافیاں مانگتے ہو..
معافیوں سے ماؤں کی گود دوبارہ ہری نہیں ہوتی..
قتل کر دیئے گئے درختوں کی جڑیں دوبارہ نہیں پھوٹتیں..
اور اب ہماری نمائش کرتے ہو..
ہمارا تماشا کرتے ہو..
جان لو کہ تمہاری تہذیب اور تمہارا رہن سہن..
ابھی کل کا قصہ ہے..
زیادہ سے زیادہ ہزار برس کی داستان ہے..

زمانوں میں یہ ایک عارضی وقفہ ہے..
جب کہ ہم ساٹھ ہزار برسوں سے اس سرزمین کے باشندے ہیں..
تم تو اگلے ایک ہزار برس میں تھک جاؤ گے..
پسپا ہو جاؤ گے..
اور ہم سفر کرتے رہیں گے..
کون ہو تم..
جو ہماری ہزاروں برس کی تنہائی میں مُخل ہو گئے ہو..

oooooo

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

''خاموشی کی آوازیں''..اولورو چٹان پر ڈوبتا سورج..

اور سُرخ بادبانوں والی کشتیاں''

دوپہر نے ڈھلنا تھا سو ڈھل گئی..

دھوپ کی شدت مدھم ہوتی گئی اور اولارا کا یہ عارضی نخلستان، یہ قصبہ سائے میں اترنے لگا..

ابورجنل لوگوں کا وہ گروہ شاپر بیگ اٹھائے، کُچھ کانوں سے سیل فون لگائے..دو بچے جن کے جوگرز اُن کے پاؤں کے سائز سے بہت بڑے تھے، ٹھپ ٹھپ کرتے کون آئس کریم چاٹتے واپس اپنی منتظر کوچ کی جانب جا رہے تھے..اگرچہ وہ اپنے گھر میں تھے لیکن ایک عجائب گھر میں تھے جہاں دور سے آنے والے سیاّح اُنہیں ایسے تکتے تھے جیسے عجائب گھر میں سجے نوادرات کو دیکھتے ہیں..

ہم نے کُچھ دیر اپنے پُرآسائش گھر میں بسرام کیا، آرام کیا، آرام کرنے سے پیشتر اطمینان کیا کہ کہیں بستر کی سفید چادر پر کوئی مقامی زہریلا مکڑا تو براجمان نہیں..پھر صحرا کی جانب سے ''خاموشی کی آوازیں'' کی صدائیں آنے لگیں..

یہ بہت خصوصی ڈنر ''خاموشی کی آوازیں'' نام کا سلمان کی جانب سے ہم دونوں کے لیے ایک خصوصی تحفہ تھا اور اسے حاصل کرنے کے تمنائی سیاّح بھی بہت تھے، سلمان نے سڈنی سے روانہ ہونے سے پیشتر نہائت تردّد سے اس کی 'بکنگ کروائی تھی..ہم نے خفیف سا احتجاج کیا کہ ایک شام کے کھانے کے لیے تین سو ڈالر خرچ کر دینا دانش مندی تو نہیں، لیکن ہم نے یہ احتجاج خفیف سا ہی رکھا کہ کہیں وہ ہمیں سنجیدگی سے لے کر، یہ ڈنر کینسل کر کے ہمیں ایک ایک برگر نہ کھلا دے..

یہ بھی اندھیرے میں ایک چھلانگ تھی، کُچھ اندازہ نہ تھا کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا

ہے..خاموشی کی آوازیں ہم کہاں سنیں گے، کدھر جائیں گے..

اگر آپ فضا سے نیچے پھیلتے اُس منظر کو دیکھیں جس کے درمیان میں ایک سیدھی ہموار سڑک پر ہماری کوچ بہتی جاتی تھی تو وہاں ایک مختصر جدید رہائشی کامپلیکس دکھائی دے گا جس سے کُچھ فاصلے پر صحرا میں ایک عظیم سُرخ چٹان پڑی ہے اور یہ کامپلیکس اور چٹان سُرخ مٹّی کی ایک کائنات میں گھرے ہوئے ہیں، یہ دو جزیرے ہیں، دو کشتیاں ہیں جو ایک سُرخ سمندر میں حنوط ہیں..وہ مٹّی اتنی تیز سُرخ تھی کہ گمان یہ گذرتا تھا کہ سُرخ رنگ کی بجری بچھائی گئی ہے..

جیسے سنکیانگ سے واپسی پر میرے نیلے جوگرز میں سے نکلا مکان صحرا کی ریت کے ذرّے گرنے لگے تھے، ایسے اُنہی جوگرز کو جب لاہور واپس جا کر اپنے سامان میں سے نکالا تو اُن کے تلووں سے سُرخ مٹّی کے ذرّے چمٹے ہوئے تھے..

آج دوپہر ریسورٹ کی ایک گائڈ سے دریافت کیا کہ محترمہ اگر میں یہاں سے نکل کر، کُھلے صحرا کو محسوس کرنے کی خاطر پیدل چلنا چاہوں تو کہیں میں واپسی کا رستہ تو نہیں بُھول جاؤں گا تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ''سر، یہ سڑک کہیں نہیں جاتی، اس قصبے کے گرد گھومتی رہتی ہے یا پھر الورورا ک تک چلی جاتی ہے، آپ گم نہیں ہو سکتے..البتہ سڑک ترک کر کے یونہی صحرا میں اتریں گے تو پرابلم ہو سکتی ہے..

ہمیں خاموشی کی آوازیں سنانے کے لیے لے جانے والی کوچ بہت دھیرج سے چلی جاتی تھی اور خاتون گائڈ ہم سے باتیں کر رہی تھی ''ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آج آپ اپنی زندگی کے ایک یادگار تجربے میں سے گذریں گے.. پہلے ہم اولورورا ک پر غروبِ آفتاب کا منظر دیکھیں گے جہاں آپ کے لیے آسٹریلیا کی سفید وائن اور شیراز کی سُرخ وائن منتظر ہے، بعد ازاں ہم صحرا کی رات میں ڈنر کریں گے اور صحرا کی خاموشی کی آوازیں سنیں گے..آپ سے درخواست ہے کہ طے شدہ راستے سے انحراف کر کے صحرا میں قدم نہ رکھئے کہ آپ کے قدموں تلے آ کر کوئی نایاب پودا مسلا جا سکتا ہے، کوئی قدیم مکوڑا جاں بحق ہو سکتا ہے..صحرا کی کنوارگی کو پامال نہ کیجیے..''

ویسے مغرب کے ایک مداح ہونے کی حیثیت سے اور وہاں عمر عزیز کے کُچھ برس بسر کرنے کے باوجود مجھے اہلِ مغرب کی یہ منطق سمجھ میں نہ آئی کہ..بے شک ایک قدیم تہذیب کو..اِنکا..ریڈ انڈین اور انانگو تہذیب کو روند کر رکھ دیجیے، اپنے پاؤں تلے مسل دیجیے لیکن براہ کرم کسی نایاب دھک مکوڑے کو جاں بحق نہ کر دیجیے گا، کسی پودے پر پاؤں نہ رکھ دیجیے گا..

جیسے ساؤتھ اینڈ آن سی میں میری ایک لینڈ لیڈی ہوا کرتی تھی جسے فرانسیسی کھانے بنانے میں کمال حاصل تھا.. مجھے ڈنر سرو کر کے وہ ٹیلی ویژن دیکھنے میں غرق ہو جاتی..کاؤبوائے فلمیں اُن کی پسندیدہ تھیں، گیری کُوپر اور جان وین دھڑا دھڑ وحشی ریڈ انڈینز کو ہلاک کر رہے ہیں..اُن کے کلہاڑوں کے مقابلے میں ان کاؤبوائز کے ہاں خود کار اسلحہ ہے اور وہ اُنہیں بے دریغ ملیا میٹ کر رہے ہیں اور میری لینڈ لیڈی بے حد لطف اندوز ہو رہی ہے لیکن جونہی کوئی ایک گھوڑا زخمی ہو کر گرتا ہے تو موصوفہ ایک دلدوز ہچکی بھر کر چھما چھم رونے لگتی ہیں کہ ہائے ہائے بے چارہ گھوڑا..تو ایک روز میں ذرا فرینک ہو گیا اور پُوچھا کہ..ٹیلی ویژن سکرین پر سینکڑوں انسان، بلکہ ریڈ انڈین مرتے دکھائے جاتے ہیں تو آپ خوش ہو کر ''پاپ کارن'' کے پھکّے مارنے لگتی ہیں لیکن جونہی ایک گھوڑا مرتا ہے تو آپ بھوں بھوں کرتی رونے لگتی ہیں تو کیوں؟..

وہ کہنے لگی ''مشیل، انسان جنگ کرتے ہیں، گھوڑے نہیں..اگر انسان ہلاک ہوتے ہیں تو یہ اُن کی پسند ہے جب کہ گھوڑے مجبور ہوتے ہیں، وہ اپنی مرضی سے میدان جنگ میں نہیں اترتے تو اُن کی ہلاکت ایک المیہ ہے..انسان کو مرنے دو..''

میرا واہمہ ہے کہ صرف ریڈ انڈینز کو مرنے دو..

افغانیوں اور عراقیوں اور فلسطینیوں کو مرنے دو..لیکن اُن کے ملک پر حملہ آور اگر ایک اسرائیلی یا امریکی مرتا ہے تو یہ ایک المیہ ہے..اُس کے لیے قومی پرچم سرنگوں کر دو..عظیم تہذیبوں کی یہی نشانیاں ہیں..

کوچ تھم گئی..

''خواتین و حضرات یہاں سے آگے ہمیں کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا..ہم صحرا کو محسوس کرتے اُس مقام تک پہنچیں گے جہاں سے ہم اولورو چٹان پر ڈوبتے سورج کا کرشماتی منظر دیکھیں گے..''

ہم کوچ سے اترے تو ایک بے انت تنہائی میں اترے..اور اُس تنہائی میں سانس لیتے تنہا ہو گئے کہ تنہائی کے بھی اپنے موسم ہوتے ہیں اور اگر وہ تنہائی آسٹریلیا کے درمیان میں ایک ویرانگی میں اتری ہو اُس کی ہوا میں ایک سانس لینے سے سُرخ مٹی میں سے پھوٹنے والے ہر بُوٹے کی مہک آپ کے اندر اتر کر ایک صحرا کو جنم دینے لگتی ہے..

اور تب ایک طے شدہ راستے پر چلتے ہوئے بارش سے سرسبز صحرا کے پار ہم نے اولورو چٹان کو ایک مدھم دُھوپ میں براجمان دیکھا..وہ آس پاس کے ویرانوں پر راج کرتی ایک ایسی مہارانی تھی جس کا لبادہ سُرخ تھا، اُس ڈھلتی شام میں اُس کی سُرخی میری آنکھوں میں ڈھلی تو وہ خون ہو گئیں..

اُس لمحے میری آنکھوں کی لہو سُرخی میں سے، حیرت، سحر زدگی اور مسرت کی سُرخ بادبانوں والی کشتیاں نمودار ہوئیں، اور وہ میرے سامنے پھیلے سُرخ صحرا کے مدھم دھوپ میں نمایاں ہوتے سرکنڈوں.. ہوا کی غیر موجودگی میں تھم چکی گھاس اور ہرے کچور بُوٹوں اور جھاڑیوں پر رواں ہوگئیں.. اُن پر میری آنکھوں میں سے جنم لینے والی سُرخ بادبانوں والی کشتیاں تیرتی جاتی تھیں اور وہ اولورو راک کے کناروں پر جا لگیں، وہیں لنگر انداز ہوگئیں.. واپس نہ آئیں!

راستے کا تعین تھا، دونوں جانب حد بندی تھی، سیاح سب کے سب اپنے اپنے تحیّر میں گُم سرگوشیاں کرتے چلے جا رہے تھے..

اور پھر منظر کُھلا..

ایک مقام آیا، جہاں ہم نے ٹھہرنا تھا.. سامنے مدھم دھوپ میں براجمان اولورو چٹان کو غروب کے منظروں میں دیکھنا تھا..

یہ مقام تو نہ تھا، دنیا کی تنہا ترین جگہ میں ایک عجب مے خانے تھا.. جیسے شمشال میں ہو.. دیوسائی کی شیوسر جھیل پر ہو..

ایک جانب ایک میز پر درجنوں باریک لمبے گلاسوں میں انگوروں کی زرد شراب لبریز تھی پر چھلکتی نہ تھی اور اُس میں اولورو چٹان کی سُرخی جھلملاتی تھی اور وہاں ہماری آؤ بھگت کے لیے خادمائیں اور غلام تھے جو طشتریوں میں جام سجائے ہر سیاح کے آگے جُھکے جاتے تھے..

عجب سحر انگیز مے خانہ تھا..

اور اس کے ڈھنگ نرالے تھے..

یہ صحرا کی ڈھلتی شام تھی، ایک بڑی تنہائی میں زردے کی فراوانی تھی.. یا کیا تھا.. کہ سب تو پینے والے نہ تھے اور اس کے باوجود سبھی خمار میں لگتے تھے..

شام کے سائے ہولے ہولے اولورو چٹان کی جانب رینگتے تھے جو ابھی تک سورج کی آخری کرنوں میں نمایاں ہو رہی تھی..

اور وہاں صرف ایک سُرخ چٹان کے نظارے نہ تھے، خمار کے کرشمے نہ تھے بلکہ موسیقی کا بھی بندوبست تھا..

ایک گورا صاحب کاؤ بوائے ہیٹ پہنے ایک قدیم ابورجنل بھونپو نما ساز سے مُنہ لگائے اُس میں

اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگاتے پھونکیں مار کر اُس میں سے ایک عجیب بھدی اور بے سُری فریاد کرتی ہوئی آواز برآمد کر رہے تھے.. مُونا اُس کے برابر میں بیٹھ کر نہائت انہماک سے یہ موسیقی سننے لگی.. یہ ساز پتہ نہیں کیا کہلاتا تھا.. ساز تو نہ تھا لکڑی کا ایک طویل بھونپو سا تھا، کسی حد تک سوئٹزرلینڈ کے قدیم دیہات میں ''یوڈلنگ'' کرنے کے لیے ایک خمدار بھونپو رائج تھا.. بس یہ اُسی کا چھوٹا یا بڑا بھائی تھا..

اور یہاں بھی ابورجنل ثقافت کی نمائندگی کرنے والا ایک گورا صاحب تھا.. یقیناً انتظامیہ نے اپنی بھرپور کوشش کی ہوگی کہ ہم کسی آبائی باشندے کو ہر شب یہاں اپنا قدیم ساز پھونکنے کے لیے مائل کر سکیں.. لیکن وہ نہ ہوئے، اُن کی انا مجروح ہوتی تھی.. وہ اپنے آپ کو فروخت نہیں کرنا چاہتے تھے..

یہ زرد اور سُرخ انگوروں کی کشید کا کمال تھا یا اس صحرائی تنہائی کی جادوگری تھی کہ کوچ میں یہاں آنے والے سیّاح تب ایک دوسرے سے کلام نہ کرتے تھے اور اب کلام ہی کرتے چلے جاتے تھے..

میری آنکھیں بار بار اولورو راک کی جانب سفر کرتی تھیں جس کے کناروں پر ان میں سے نمودار ہونے والی سُرخ بادبانوں والی کشتیاں لنگر انداز ہو چکی تھی..

جب وہ گورا کاؤبوائے ہیٹ والا اُس ساز میں پھونک مار مار کر ادھ موا ہو گیا تو اُس نے یہ لمبوترا ساز ایک جانب رکھ دیا اور فوری طور پر زرد وائن کے کم از کم تین گلاس اپنے سوکھے ہوئے حلق میں انڈیل کر ہوش میں آ گیا..

اُس کی واحد مدّاح مُونا تھی..

ایک خمار آلود سیّاح نے اُس بھونپو ساز کو چُھو کر دیکھنا چاہا تو وہ تقریباً مشتعل ہو گیا ''اسے مت چھوؤ.. اس کی قیمت تمہارے ڈنر کی قیمت سے کہیں زیادہ ہے..''

مجھ پر خصوصی انعام نازل ہوتے رہتے تھے..

دنیا کے ہر خطّے میں میرے رب نے مجھ پر اپنے حیرت انگیز منظر منکشف کیے.. اور اس عُمر میں پہنچ کر میں سمجھ بیٹھا تھا کہ اب مجھ پر کچھ نازل نہ ہوگا جب اولورو چٹان پر ڈوبتے سُورج کا منظر نازل ہو گیا..

غروب کے سائے رینگتے ہوئے اولورو چٹان کے ساحلوں تک پہنچ رہے تھے..

اُس کے ساحلوں تک جتنے بھی صحرا کے بوٹے اور شجر تھے وہ تو شب کی سیاہی میں اتر چکے تھے، صرف اولورو چٹان تھی جو ابھی تک اُس شب کی سیاہی میں نمایاں ہو رہی تھی..

○○○○○

''عجیب سودائی کر دینے والا منظر..اور ایک ڈِنگو سے ملاقات''

اس دوران اِس صحرائی پارٹی میں ایک مدعو نہ کیا جانے والا مہمان نمودار ہو گیا..

اور یہ ''ڈِنگو'' تھا..

وہ ایک نہائت معمولی ''ڈگ'' سا بے فضول کتّا تھا جسے پچکارنے یا ''ہیلو ڈگی'' کہنے کو قطعی جی نہ چاہتا تھا لیکن وہ جس بے چارگی سے میری جانب دیکھ رہا تھا میرا دل پسیج گیا اور اُس کا دل رکھنے کی خاطر اُسے پچکارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہماری خاتون گائڈ نے ہراساں ہو کر کہا ''سَر..پلیز اس کے قریب مت جائیے..''

''محض کُتّا ہے..''

''نہیں سر..یہ کُتّا نہیں ڈِنگو ہے..''

''شکل سے تو کُتّا ہی لگتا ہے..''

''اگرچہ کُتّا ہے پر کُتّا نہیں ہے، ڈِنگو ہے..خطرناک ہے..''

الاروایئر پورٹ پر اتر کر جب ہم منتظر کوچوں کی جانب چلے جا رہے تھے تو لاؤنج میں ایک سیاحتی اشتہار آویزاں تھا جس پر ایک کُتّے کی تصویر نقش تھی ''براہ کرم اِن جنگلی کتّوں اور ڈِنگوز سے ہوشیار رہیے..ڈِنگو جنگلی جانور ہیں، انہیں محض کُتّے مت سمجھئے..اپنی جان کی حفاظت کی خاطر ان سے دور رہئے اور انہیں خوراک کھلانے کی کوشش مت کیجیے..اگر آپ کا سامنا ایک ڈِنگو سے ہو جاتا ہے اور آپ خطرہ محسوس کرتے ہیں تو پُرسکون رہئے..یکدم سر پر پاؤں رکھ کر بھاگئے نہیں اور نہ ہی خوفزدہ ہو کر اپنے ہاتھ لہرایئے ورنہ ڈِنگو اشتعال میں آ جائے گا..بہت آہستگی سے پسپائی اختیار کیجیے اور مدد کے لیے پکاریئے..''

مجھے یقین تھا کہ یہ سب خطرناکی کے بھونپو سیاحوں کو خواہ مخواہ خوفزدہ کرنے کے لیے بجائے گئے تھے..ورنہ وہ ہماری گلیوں میں پھرتے آوارہ ''ڈبّو'' کتّوں سے بھی گیا گذرا تھا..ایک بے چارہ اور قابل ترس کتّا تھا جسے ڈِنگو جیسا خطرناک نام دے دیا گیا تھا..

اناگوز بان میں اسے پاپا انورو کہتے ہیں..

جنگلی حیات کے محقق کہتے ہیں کہ یہ آسٹریلیا میں شکار کرنے والے جانوروں میں سے سب سے بڑا ہے..اگر یہ سب سے بڑا ہے تو چھوٹا پتہ نہیں کتنا چھوٹا ہوگا، کوئی چھپکلا ہی ہوگا..اور یہ ایک ایشیائی جانور ہے جو ساڑھے تین ہزار برس پیشتر آسٹریلیا میں آیا تھا..کیسے یہاں آیا تھا، پاکستان یا برما وغیرہ سے یا شائد چین سے تیرتا ہوا یہاں آ گیا تھا، یا کسی سمندری جہاز میں سوار ہو کر آیا تھا، کیسے آیا تھا..جیسے شرع بعض معاملات کے بارے میں خاموش ہے اسی طرح محقق حضرات بھی اس کی آمد کے ذرائع کے بارے میں خاموش ہیں..بہر طور یہ کسی نہ کسی طور ایشیا سے ادھر آ گیا..کچھ عرصہ ابورجنل لوگوں کے ساتھ گھومتا پھرتا رہا اور پھر آوارہ ہو گیا اور یہ پاپا انورو شکار کا شوقین ہے..کیڑے مکوڑے، چھپکلیاں اور کرلے اس کی مرغوب خوراک ہیں، مردہ جانوروں کو بھی شوق سے کھاتا ہے اور کچھ نہ ملے تو سبزی خور ہو جاتا ہے، گھاس کھا کر گذارہ کر لیتا ہے..اور ہاں اس کے کتا نہ ہونے کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ بھونکتا نہیں..اور وہ کتا ہی کیا جو بھونکتا نہ ہو کہ آوازِ سگاں ہی تو اُس کی پہچان ہے..بس کبھی کبھار تھوتھنی اٹھا کر تھوڑی سی ہاؤ ہو کر کے طمانیت حاصل کر لیتا ہے..

چنانچہ میں نے اپنی زندگی کے پہلے ڈنگو کو دور سے ہی پچکارا اور بہت آہستگی سے پسپائی اختیار کر لی..

اور حیرت در حیرت میرا نیویارکی پوتا ابراہیم ایک ڈنگوا ایکسپرٹ تھا، اُس نے فون پر ڈنگو کی حیات پر ایک تفصیلی لیکچر دیا اور وہ بار بار پُوچھتا تھا کہ دادا کیا واقعی آپ نے سچ مچ کا ایک ڈنگو آسٹریلیا میں دیکھا ہے..موصوف چھ برس کے ہیں اور ابھی سے ماہر جانورات اور حشرات وغیرہ ہو چکے ہیں..

ڈھلتی شام کے سائے اب وہاں تک پہنچ رہے تھے جہاں میری آنکھوں سے روانہ کردہ سُرخ بادبانوں والی کشتیاں لنگر انداز تھیں اور پھر وہ کشتیاں تاریک ہونے لگیں، سورج کی آخری کرنیں مدھم ہونے لگیں، غروب کا کوہ پیما اولورو چٹان پر چڑھنے لگا، اُسے تاریک کرنے لگا اور پھر چند لمحوں میں آسمانوں سے گری ہوئی وہ مقدس چٹان نیم اندھیارے کے سمندروں میں روپوش ہونے لگی..

عجیب سودائی کر دینے والا منظر تھا..

سورج غروب ہو چکا تھا لیکن اولورو چٹان مکمل طور پر اوجھل نہ ہوئی تھی، ایک واہمے ایک خواب کی صورت نظر آ رہی تھی..

سب آنکھوں میں غروب کا یہ منظر نقش ہو رہا تھا، سب آنکھیں سحر زدہ، سحر زدہ اولورو چٹان پر ٹھہری ہوئی تھیں..

سحر زدہ! سحر زدہ!

○○○○○

''صندوقچی میں پوشیدہ ایک تمنا..ڈِنگو چلے جاؤ، یہاں میری نانی جان نہیں ہیں''

ہماری گائڈ خاتون جس کا یہ روزانہ معمول تھا جانتی تھی کہ غروب کے اس منظر کو آنکھوں میں اتارنے کے بعد سیاّح اِک عالم حیرت میں ہوتے ہیں اور جب تک اُنہیں متوجہ نہ کیا جائے وہ اپنے اپنے مقام پر حنوط شدہ حالت میں کھڑے رہتے ہیں، اُن کے بدن سُرخ مٹی میں جڑیں پکڑ جاتے ہیں تو اُس نے ذرا بلند آواز میں ہمیں مخاطب کیا ''خواتین وحضرات..کیا آپ سب یہیں زندگی گذار دینا چاہتے ہیں، ابھی تو اس شب کا سب سے سحر انگیز تجربہ ہمارے لیے منتظر ہے..ہم خاموشی کی آوازیں سنیں گے، صحرا کی خاموشی اور ویرانگی کے اندر آپ کے لیے قدیم اور جدید ذائقوں والا ڈنر..آپ کا منتظر ہے..چلے آیئے..''

مبہوت کھڑے سیاّحوں میں یکدم جان پڑ گئی..جیسے وہ ابھی شی آن کے مٹی کی فوج کے ہزاروں برسوں سے ساکت کھڑے سپاہی ہوں اور پھر کسی طلسم کی پھونک سے زندہ ہو گئے ہیں..

ہم پلیٹ فارم سے اتر کر ایک طے شدہ سُرخ مٹی کے راستے پر چلنے لگے اور راستہ نیم تاریکی کے باوجود اس لیے دکھائی دے رہا تھا کہ مٹی کے ہر سُرخ ذرّے میں ابھی تک ڈوب چکے سورج کی مدھم لو پھوٹتی تھی..

اور پھر یکدم منظر کُھلا..

صحرا میں گویا بارات اتری ہوئی تھی..

صحرا کی رات میں مشعلیں بھڑکتی تھیں اور اُن کے گرد براق میز پوشوں سے ڈھکی گول میزوں پر دمکتے چُھری کانٹے، باریک گلاس، گلدان اور اُن کے درمیان میں موم بتیاں جھلملاتی اُس صحرائی ماحول کو ایک الوہی سراب میں خواب کرتی تھیں..نفیس وردیوں میں ملبوس مؤدب ویٹر ہماری چاکری کرنے، آؤ بھگت کرنے

کے منتظر تھے..

صحرا میں بہار آئی ہوئی تھی..

اور ایک ہلکی سی خنکی بدن میں سرائت کرتی تھی.. جیسے صحرا میں چلے ہولے سے بادِ نسیم..

جنگل میں کیا ہی منگل تھا.. بلکہ وہ آسانی سے بُدھ یا جمعرات بھی ہوسکتا تھا ایسے پُرتکلف اور روشن اہتمام تھے..

ہر میز کی قربت میں صحرا کی گئی شب کی خنکی کے پیشِ نظر ہیٹر نصب کیے گئے تھے.. ہماری میز پر ہم تینوں، میمونہ، سلمان اور میرے علاوہ جو سات سیاّح خواتین وحضرات براجمان ہوئے تو وہ اُس شب کے آغاز میں اجنبی تھے لیکن اُس کے اختتام تک ہم اتنے قریب آچکے تھے کہ ایک دوسرے کے پیشوں، شادیوں، ناکام محبتوں اور طلاقوں وغیرہ سے آگاہ ہو چکے تھے اور اس سرخوشی کا سبب صرف وہ صحرائی تنہائی نہ تھی، وہ آسمان ہی نہ تھا جو خطرناک حد تک اتنا قریب آچکا تھا کہ ہم پر گر سکتا تھا اور ہم اُس میں ٹانکے ہوئے کسی ستارے کو توڑ کر اپنی جیب میں چُھپا سکتے تھے بلکہ اُس مئے ارغوانی کی فراوانی بھی تھی جسے ویٹر بے دریغ باریک اور نازک گلاسوں میں بنا پُوچھے انڈیلتے جاتے تھے..

ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے..

میں باتیں کرتا کرتا یکدم اس پورے پُرمسرت ماحول سے غافل ہو جاتا، میری آنکھیں ان شعلوں کی بھڑک اور سیاّحوں کی بے دریغ خوشی کے پار، اب بھی نمایاں، اگرچہ ایک وہم اور ایک گمان، اولورو چٹان کے حُجم تک سفر کر جاتیں.. اور میں اُس کے کناروں پر لنگر انداز سُرخ بادبانوں والی کشتیوں کی شباہتوں کی کھوج کرتا.. اُن کشتیوں نے میری سُرخ متجسس آنکھوں میں سے جنم لیا تھا، گویا یہ میری آنکھیں تھیں جو اولورو چٹان کے کناروں پر لنگر انداز تھیں..

میں یہاں تھا بھڑکتی شعلوں کی روشنی میں اور میری آنکھیں وہاں تھیں ایک چٹان کی سُرخی سے اس شب کی تاریکی میں ہم آغوش ہوتی..

ہمارے عقب میں بُوفے ڈنر کے وسیع اور پُرتکلف انتظامات میں مشغول ایک تجربہ کار عملہ تھا..

لیکن ابھی ڈنر کہاں.. ابھی تو ستاروں سے آگے جہاں اور بھی تھے..

بلکہ بابا ابو ذری کے بقول.. ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں.. پراں سے پراں اور بھی ہیں..

اس دوران ہمیں مکمل طور پر بُھوکا نہ رکھا گیا.... پنیر کے قتلے، سلاد کے سینڈوچ، عجیب سے سموسے،

جو سو سے کم اور دو سو سے زیادہ تھے کہ اُن کے اندر پتہ نہیں کیا بھرا ہوا تھا.. زیتون کا اچار.. یہ سب مختصر خوراکیں چلی آتی تھیں.. اور یہ سلمان تھا جو سب سے زیادہ چہک رہا تھا اگرچہ اُس کی چہک میں مئے ارغوانی کا کچھ عمل دخل نہ تھا لیکن وہ ایک صحرائی محفل میں ایک کہنہ مشق داستان گو کی مانند سب کو متوجہ کئے ہوئے تھا.. وہ مارکیٹنگ کا ایک وسیع تجربہ رکھتا تھا اور لوگوں کو مسخر کرنے کا ہنر جانتا تھا..

میمونہ اگرچہ اب بھی تینتالیس برس بعد بھی کبھی کبھار ایک مُشکل بیوی ہو جاتی ہے لیکن اُس میں اپنے آپ کو کسی بھی ماحول اور رفاقت میں ڈھل جانے کی صلاحیت حیران کُن ہے.. اگرچہ میں کچھ مُجرم سا محسوس کر رہا تھا.. مجھے معلوم تھا کہ وہ ان معاملوں میں زیادہ روشن خیال نہیں ہے.. ''تم.. مائنڈ تو نہیں کرتیں کہ ہماری میز پر براجمان بیشتر لوگ وائن پی رہے ہیں..''

''نہیں، یہ ان کا اپنا فعل ہے مجھے اس سے کچھ غرض نہیں.. لیکن ذرا نوٹ کرو کہ یہ لوگ بہکتے نہیں، اپنے آپ میں رہتے ہیں، ذرا کھلنڈرے سے ہو جاتے ہیں پر تہذیب کے دائرے میں رہتے ہیں..''

ہمارے سامنے جو انجینئر صاحب اپنے بیٹے کے ہمراہ بیٹھے تھے ایک بلانوش تھے، ویٹر بھی جانتا تھا کہ حضرت کا گلاس ابھی لبریز کیا اور ابھی ایک ہی سانس میں خالی ہو گیا تو وہ اُن کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا اور بصد ادب دریافت کرتا کہ آسٹریلیا کی زرد وائن پیش کروں یا سُرخ شیراز..

تو وہ پکار اٹھتے ''شیراز.. شیراز..''

اُندلس کے شہروں کے جغرافیے میں شہر JEREZ کے بارے میں درج ہے کہ ایران کے شہر شیراز کا ایک خاندان جو انگوروں کی شراب کشید کرنے میں شہرت رکھتا تھا، بہتر مستقبل کی خواہش میں اُندلس منتقل ہو گیا، جیسے ان دنوں لوگ امریکہ یا آسٹریلیا منتقل ہو جاتے ہیں اسی طور اُن زمانوں میں بہتر زندگی کے لیے مسلمان اندلس میں جا آباد ہوتے تھے.. اس خاندان نے ایک بے آباد رقبے پر شیراز سے جانے کس طرح لائی گئی انگور کی بیلیں کاشت کیں اور پھر اُن سے شراب کشید کی جو یورپ بھر میں بے حد مقبول ہوئی.. اُنہوں نے اپنے آباد کردہ قصبے کا نام شیراز رکھا جو اب JEREZ کہلاتا ہے یعنی خیریز جو شیراز کی ایک ہسپانوی شکل ہے.. لیکن آج بھی اُس خطے کی وائن ''شیراز'' کے نام سے بے حد پسندیدہ ہے بلکہ جتنے ملک بھی وائن میکنگ میں نامور ہیں، فرانس، جرمنی یا پھر آسٹریلیا یہ سب اُسی اُندلسی ترکیب کے ساتھ اپنی اپنی ''شیراز'' کشید کرتے ہیں..

تو میں نے مناسب جانا کہ آسٹریلیا کے صحرا کی شب میں جس مے ''شیراز'' کی فراوانی تھی، اُس کے مے خواروں کو اس کے تاریخی پس منظر سے آگاہ کر دیا جائے.. یکدم ہماری میز کے شریک سیاح چُپ سے

ہو گئے..جاموں کی کھنک میں وقفہ سا آ گیا اور پھر کسی نے کہا''میں یقین نہیں کر سکتا..''

''آپ نہ کریں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آج سے تقریباً آٹھ سو برس پیشتر ایک ایرانی خاندان نے بنوامیہ کے اُندلس میں یہ شیراز متعارف کروائی تھی..آپ گھر واپس جا کر نقشے میں ایران کے شہر شیراز کا تعین کر سکتے ہیں..اور ہاں اگر آپ عمر خیام کے نام سے واقف ہیں تو اُس کی شاعری کی بنیاد ہی یہی شیراز کی شراب ہے۔''

''آہ عمر خیام..''ایک عمر رسیدہ خاتون نے ہچکی بھر کر کہا''میں اُسے جانتی ہوں..وہی جو کہتا ہے کہ ایک ندی کنارے میرا محبوب میری آغوش میں ہو،شراب کا جام ہو اور شعروں کی ایک کتاب ہو تو بس یہی جنت ہے..''

''بالکل..''

ایک اور صاحب جو عمر خیام سے واقف تو نہ تھے پر خیام کی مانند خمار میں تھے،کہنے لگے''تو ہم جو شیراز پی رہے ہیں،عمر خیام بھی یہی انگوروں کی شراب پیتا تھا..''

''بالکل..''

''تو پھر ہم اُس کی یاد میں اولورو چٹان کے سائے میں شیراز کا ایک اور جام پئیں گے..چیئرز..''

اب وہ لوگ جنہیں شاعری کی زبان میں مے خوار کہا جاتا ہے اور عرف عام میں شرابی کہا جاتا ہے..وہ ہمہ وقت شراب پینے کے لیے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں..جیسے اپنے چچا غالب..میر تقی میر،عمر خیام اور حافظ کا تو ذکر ہی کیا..فیض اور فراز..حضرت عدم،جوش اور مجاز..اور یہ ایک نامکمل فہرست ہے..بہانے تلاش کرتے ہیں کہ ذرا جی اداس ہوا یا خوش ہوا..یا بادل آ گئے..محبوب یاد آ گیا تو شگفتہ شگفتہ بہانے ترے..مے خانے ترے..

غالب نے جب کہا کہ

؎ غالب چھٹی شراب مگر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شب مہتاب میں..

تو اس پر میرے چھوٹے بھائی کرنل مبشر نے اور وہ بھی ایک تخلیقی ادیب ہو سکتا تھا،اگر وہ فوج کے دام میں نہ آ جاتا..اُس نے کہا تھا کہ بھائی جان لگتا ہے کہ غالب صاحب چراپونجی میں رہتے تھے جہاں ہمہ وقت بادل چھائے رہتے ہیں،ہندوستان میں سب سے زیادہ بارشیں ہوتی ہیں اور اس کے سوا شب مہتاب کا بھی کچھ شمار تو نہیں..چاند تو نکلا ہی رہتا ہے تو..غالب کے بہانے..

کچھ اسی طور یہاں بھی اُس صحرا کی عظیم تنہائی کے اندر مے خوار بہانے تلاش کرتے تھے..عمر خیام کو نہ

جانتے ہوئے بھی اُس کی یاد میں ایک اور جام چڑھاتے تھے..

میں نے اولورو چٹان کو غروب کے منظروں میں ڈوبتے دیکھنے والے سیاحوں میں ایک ایسے جوڑے کو بار بار دیکھا تھا، اُس اجتماع میں سب سے دراز قامت، وسیع تن وتوش کے میاں بیوی.. جو اتنے موٹے تھے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا تو سکتے تھے، لپٹ نہیں سکتے تھے، لیکن نہائت سادہ اور معصوم خصلت کے، خوش مزاج اور بھولے بھالے.. وہ صاحب ایک ٹرک ڈرائیور تھے اور اُن کی بیگم.. جنہوں نے اپنے بال آتش ناک سُرخی میں رنگوائے ہوئے تھے.. یعنی صحرا کی سُرخ مٹی کی نسبت اُن کے بال زیادہ سُرخ تھے، اُن سے پُوچھا کہ آپ کیا کرتی ہیں تو وہ کہنے لگی.. مجھے تو اپنے خاوند کے لیے کھانے بنانے سے ہی فرصت نہیں ملتی، میں بس یہی کرتی ہوں تو وہ ٹرک ڈرائیور صاحب.. بھی چونکے "تمہارا مطلب ہے کہ میں اس وقت ایران کے ملاؤں کی کشیدہ کردہ شراب پی رہا ہوں.."

میں نے اُن کی ڈھارس بندھائی کہ برادر ہراساں ہونے کی چنداں حاجت نہیں ہے.. یہ تو سینکڑوں برس پیشتر کے قصے ہیں اور تب ہم گمراہ لوگ تھے، شراب کی کشیدگی ایسی مذموم حرکات کرتے رہتے تھے.. لیکن شیراز.. ایک ایرانی شراب ہے.. اس دوران صحرا کی تاریکی میں سے کُچھ ہاؤ ہو کی آوازیں آنے لگیں اور پھر یکدم اُس تاریکی میں سے وہی حضرت نمودار ہوئے جو آج دوپہر بدن پر سفید دھاریاں پینٹ کیے ابورجنل رقص پیش کر رہے تھے..

اُن میں سے ایک "وحشی" نے ہاتھوں میں تھامی دو لکڑیاں بجاتے ہوئے خوب ادھم مچایا.. کُچھ دیر دھما چوکڑی مچا کر وہ پھر سے اندھیرے میں روپوش ہو گئے..

حاضرین نے اُن کی پرفارمنس پر خوب خوب تالیاں بجائیں.. کیوں بجائیں؟.. وہ ایسی سرمست کیفیت میں تھے کہ اُنہیں تالیاں بجانے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت تھی.. یعنی اگر کوئی سیاح اٹھ کر اعلان کرتا کہ خواتین وحضرات مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ میری ایک رشتے کی پھوپھی جان برزبین میں انتقال کر گئی ہیں تب بھی وہ اسی جوش وخروش سے تالیاں بجاتے، بے شک بعد میں بھوں بھوں کرتے رونے لگتے..

؎ دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

بہت دیر سے مجھے.. تمباکو کے ذائقے کی طلب ہو رہی تھی اور میں آگاہ تھا کہ یہاں میز پر بیٹھے ہوئے سگرٹ سلگانا معیوب ہوگا، چنانچہ میں نے برابر میں کمربستہ ویٹر سے استفسار کیا "یہاں کہیں سگرٹ پیا جا سکتا ہے؟"

اُس نے شعلوں کی روشنی جہاں مدھم پڑنے لگتی تھی، صحرا کے اُس کنارے کی جانب اشارہ کیا

''سر ..آپ صحرا کے اندر جا کر سگرٹ نہ پیجئے گا..وہاں ایک سموکنگ ایریا ہے کناروں پر..''

دنیا بھر میں سگرٹ پینے والے شودر اور اچھوت قرار دیئے جا رہے ہیں..اگر آپ ایک سگرٹ سلگا لیتے ہیں تو لوگ آپ کے قتل پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ تمہارے سگرٹ کا دھواں ہی اس طویل زندگانی کے راستے میں رکاوٹ بن جائے گا..تمام ایئرپورٹ پبلک پارک.. یہاں تک کہ بہت سی گلیاں اور بازار بھی...سگرٹ نوشی ممنوع.. یہاں تک کہ شراب خانوں میں شراب جائز جو دل اور جگر کو راکھ کر دیتی ہے لیکن سگرٹ نوشی ممنوع..اور وہ کیسے زمانے تھے جب ہمفری بوگارٹ سے لے کر اشوک کمار تک سگار اور سگرٹ کے دھوئیں اڑاتا خواتین کے بدنوں میں لذت بھرتا تھا..ماؤزے تنگ، ایک چین سموکر اور فڈل کاسترو سگار چباتا دنیا کی تقدیر بدل دیتے تھے..یہاں تک کہ اپنے قائداعظم بھی سگرٹ اور سگار کے بغیر شائد پاکستان کا نقشہ ترتیب نہ دے سکتے..

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا نے سکھ مذہب اختیار کر لیا ہے جس میں تمبا کو حرام ہے..

بہرطور میں اپنے ہم میز دوستوں سے معذرت کر کے صحرا کنارے اُس گوشے تک چلا گیا جو تمبا کو نوشی کے لیے مخصوص کیا گیا تھا..

اور وہاں اُس گوشے میں پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو صحرا کی شب میں شعلوں کی روشنی تھی..فروغِ مے سے گلستاں ہوتے چہرے تھے..میں نے سگرٹ سلگایا اور پرے صحرا کی گمشدہ ویرانگی سے پرے آنکھیں میچ کر دیکھا تو وہاں اولورو چٹان کے شانے اب بھی نمایاں تھے..میں نے دیکھا کہ ہماری میز کی ایک ساتھی، سنہری بالوں والی تقریباً ادھیڑ عمر خاتون جن کی دل کشی ڈھلتی جاتی تھی اور وہ کسی کالج میں پڑھاتی تھیں، چلی آ رہی ہیں..وہ میرے قریب آ کر کہنے لگیں..''میں تو سگرٹ پینے کے لیے مری جاتی تھی..تمہارے پاس لائٹر ہے؟''

جب میں نے لائٹر جلا کر اُس کے لبوں میں دبا سگرٹ جلایا تو اُس کے عمر رسیدہ مگر نقش دل نشیں نظر آنے لگے..

''میں نے زندگی آسان نہیں گذاری..ایک جانور کی مانند دن رات مشقت کی ہے..اور اس دوران میں اپنی خواہشوں کو جمع کرتی گئی..ہر خواہش کو ایک صندوقچی میں بند کیا اور اسے اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کر لیا کہ جب مجھے بالآخر فراغت ہو گی، مالی آسودگی نصیب ہو گی تو میں یہ خواہش پوری کروں گی..اور یہ زیادہ تو نہیں، بس چار پانچ صندوقچیاں تھیں جن میں میری خواہشیں محفوظ تھیں..اور پچھلے ماہ جب میں نے اُن میں سے ایک صندوقچی کھولی تو اس میں اولورو چٹان کو دیکھنا اور اُس کے پس منظر میں ایک شب گذارنا، ایک خواہش محفوظ تھی..''

وہ ایک خوش بخت عورت تھی..اُس کی تمناؤں کے صندوقوں میں محفوظ کم از کم ایک خواہش تو پوری ہوگئی..ورنہ ہم لوگوں کے خوشیوں کے صندوق تو کبھی نہیں کُھلتے..اُن کے قفل زنگ آلود ہو جاتے ہیں اور اُن کے اندر جو خواہشیں ہم محفوظ کرتے ہیں، وہ دم گُھٹنے سے مر جاتی ہیں..تو وہ ایک خوش بخت عورت تھی..

سگرٹ کا آخری کش لگا کر وہ مسکرائی.."پھر یہیں ملیں گے، اگلے سگرٹ تک، تم آ جاؤ گے تو لطف رہے گا.."

وہ خاتون ایک موج کے عالم میں ڈائننگ ٹیبل کے روشن ماحول کی جانب چلی گئی تو مجھے احساس ہوا کہ ہم دونوں سگرٹ نوش وہاں اکیلے نہ تھے، جہاں سے صحرا کی تاریکی شروع ہو جاتی تھی وہاں ایک ڈِنگو جانے کب کا کھڑا تھا..اگرچہ میں کتّوں کی شکلوں کا ماہر تو نہیں ہوں لیکن یہ طے تھا کہ یہ کتا یا ڈِنگو وہ والا ڈِنگو نہ تھا جو سنہری شراب کے جاموں کی اوٹ میں سے آ نکلا تھا..

میں اُسے نہ تو شُو شُو کر کے بھگا سکتا تھا کہ وہ سرکاری اطلاعات کے مطابق خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اور نہ ہی اُسے ایک عدد پتھر مار کر دفع دور کر سکتا تھا کہ وہ ڈِنگو تھا، اس سرزمین کا آبائی باشندہ تھا، اُسے حق حاصل تھا کہ وہ اپنے گھر میں جہاں چاہے جائے یا آئے..جب کہ میں اجنبی تھا جو اُس کی خلوت میں مُخل ہوا تھا..شائد وہ ایک بُھوکا ڈِنگو تھا جو خوراک کی خوشبو سونگھتا چلا آیا تھا..میں اُسے کسی قسم کی خوراک مہیا نہ کر سکتا تھا کہ جنگلی جانوروں کو خوراک کھلانا ایک جُرم تھا..

مجھے یاد ہے کہ گاؤں میں جب سرِشام ہم اپنی نانی جان کے ہاں صحن میں ایک چنگیر کے گرد گھیرا ڈالے تندوری روٹیوں اور دیسی مُرغی کا سالن کھا رہے ہوتے تھے تو صحن کے کُھلے دروازے میں سے نہائت باادب گلیوں کے آوارہ کُتّے وقفے وقفے کے ساتھ داخل ہوتے تھے اور ایک فاصلے پر نہائت بردباری سے کھڑے ہو کر دُم ہلانے لگتے تھے..اور تب نانی جان اُن کے آگے تندور کی موٹی روٹی کا "چپّہ" ڈال دیتی تھیں جسے وہ تشکر آمیز نگاہوں سے قبول کر کے دانتوں میں دبا کر چلے جاتے تھے..نانی جان کو حساب تھا کہ کتنے کُتّے روٹی کی آس میں ہمارے صحن میں داخل ہوں گے اور وہ اُن کے لئے الگ سے چند روٹیاں لگواتی تھیں اور پھر اُن کے "چپّے" کر کے چنگیر میں رکھ لیتی تھیں..جب کبھی کوئی بچّہ ایک چپّہ اٹھا لیتا تو وہ سختی سے ڈانٹ دیتیں "یہ کُتّوں کا رزق ہے، اسے ہاتھ مت لگاؤ.." چنانچہ میں اُس کُتّے سے کہنا چاہتا تھا کہ بے شک تم ایک ڈِنگو ہو لیکن ہو تو کُتّے..سوری میں تمہیں کوئی خوراک نہیں کھلا سکتا، اگر تم میری نانی جان کے زمانوں میں ہمارے گاؤں کی گلیوں کے آوارہ کُتّے ہوتے تو ہر شام تمہیں دیسی گندم کی روٹی کا ایک چپّہ باقاعدگی سے ملتا جاتا..لیکن تم تو ایک آسٹریلوی ڈِنگو ہو، تمہیں کھلانے پلانے پر پابندی ہے..تو چلے جاؤ، یہاں میری نانی جان نہیں ہیں!

○○○○○

''ہم کنگرو اور مگرمچھ کھاتے ہیں..اَج چن تارے نیویں لگدے نیں''

ڈنر کا آغاز ہوگیا..

سب سے پہلے نہائت اہتمام سے ہماری خدمت میں ایک سپیشل سُوپ پیش کیا گیا جو کسی مشہور باورچی کی سپیشلیٹی تھی.. بہت زبردست تھا لیکن ذائقہ شناسا سا لگتا تھا..معلوم ہوا گھیا کدّو کا سُوپ ہے..

پھر اعلان ہوا کہ اب بُوفے کی گرم گرم خوراکیں آپ کی منتظر ہیں، آیئے اور اپنی مدد آپ کیجئے.. اور جی بھر کے کیجئے..اور وہاں اتنی ورائٹی تھی کہ اُسے دیکھ کر ہی جی بھر گیا.. چناؤ مُشکل ہو رہا تھا، بہرحال میں نے سفید چکن، پاستا اور مچھلی کے کُچھ قتلے اپنی پلیٹ میں منتقل کئے تو میرے آگے ہرڈونگے کو پہلے دیکھتی پھر سُونگھتی مُونا نے کہا ''یہ لو..''

''یہ کیا ہے؟''

''کنگرو ہے..''

''کنگرو..یہ..میرا مطلب ہے حلال ہے؟''

''حلال ہی ہوگا..بکری کی اپاہج قسم ہی ہے ناں..چکھنا تو چاہئے..''

چنانچہ میں نے سوچا کہ اگر آسٹریلیا آئے اور کنگرو نہ کھایا تو کیا کھایا چنانچہ میں نے کنگرو کے گوشت کے دو چار چوکور ٹکڑے سے پلیٹ میں ڈال لئے..ذرا آگے بڑھے تو مُونا رُک گئی..ہرڈش کے اُوپر خوراک کا نام درج تھا، اُس نے جُھک کر تعین کیا کہ کیا ہے، اپنی مدد کرنے کے بعد مُجھے متوجہ کیا ''یہ بھی لو..''

''اور یہ کیا ہے؟''

''مگر مچھ ہے..''

''تمہیں کیسے پتہ ہے؟''

''بھئی لکھا ہوا ہے، کراکوڈائل..''

کنگرو تک تو میں کسی حد تک مفاہمت کر سکتا تھا لیکن مگر مچھ..

''تم کھا رہی ہو؟''

''ہاں.. میں نے دو تین قتلے چھوٹے چھوٹے سے اپنی پلیٹ میں منتقل کر لئے ہیں، تم بھی لو..''

''اب یہ تو حلال نہیں ہو سکتا..''

''آبی جانور ہے.. حلال ہی ہوگا.. ویسے میں نے آج تک کسی مذہبی کتاب میں نہیں پڑھا کہ مگر مچھ حلال نہیں ہے..''

''لیکن ہے تو مگر مچھ..''

''چکھنا تو چاہئے.. روز روز مگر مچھ کھانے کو کہاں ملتا ہے، زندگی میں ایک بار تو مگر مچھ کھانا چاہئے.. یہ اتنے لوگوں کو کھا جاتا ہے، اسے کھانا تو چاہئے..''

میں نے شکر کیا کہ ڈنر میں ڈنگو شامل نہ تھا، ورنہ مُونا کہتی کہ یہ کتا تو نہیں ڈنگو ہے اور کسی بھی مذہبی کتاب میں ڈنگو کے حرام ہونے کا تذکرہ نہیں..

مُونا کچھ زیادہ ہی روشن خیال ہوئی جاتی تھی..

کنگرو کا گوشت کچھ پھُسپھسا سا اور پھیکا تھا.. اگر میں ایک انانگو اس سرزمین کا آبائی باشندہ ہوتا تو شائد میں اس سے بے پناہ لطف اندوز ہوتا کہ وہاں اس کے سوا کسی اور جانور کا گوشت میسّر نہ تھا.. بھلا جن کے ذائقے کے خلیے، گائیوں، بھینسوں، بیلوں، بکروں، بھیڑوں، دُنبوں، مچھلیوں اور مرغابیوں اور تیتروں وغیرہ سے آشنا ہوں بلکہ جو روسٹ چڑوں سے بھی رغبت رکھتے ہوں اُنہیں غریب کنگرو کہاں پسند آئے گا..

اور وہ جو مگر مچھ تھا.. وہ یقیناً ایک بزرگ مگر مچھ تھا جس کی کھال سے جُوتے اور ہینڈ بیگ وغیرہ تو بنائے جا سکتے تھے لیکن اُس کا گوشت.. چبایا نہیں جا سکتا تھا، جس طرح مگر مچھ شکار کو ''آہم'' کر کے نگلتا ہے ایسے ہی نگلنا پڑتا تھا.. اور جب اُسے نگل لیا تو میں نے کچھ دیر انتظار کیا کہ جانے یہ پیٹ میں جا کر کیسی ہلچل مچاتا ہے، کروٹیں بدل کر میرے نظام ہضم کو اتھل پتھل کرتا ہے لیکن شائد وہ ایک شریف اور اپنی قسمت پر قانع مگر مچھ تھا اگر نہ ہوتا تو مارا نہ جاتا، مارنے والے کو نگل لیتا.. ویسے آپس کی بات ہے کنگرو کھانے اور مگر مچھ نگلنے کے بعد

میں نے اپنے آپ کو قدرے آسودہ محسوس کیا..

عجب شب تھی.. ایک صحرائی تنہائی میں عجوبہ بندوبست تھے، زندگی کی کڑواہٹ بھولتی جاتی تھی اور میں جانتا تھا کہ.. یہ رات پھر نہ آئے گی، جوانی تو بیت چکی، بقیہ زندگانی بھی بیت جائے گی.. لیکن یہ رات پھر نہ آئے گی..

ہر سرخوشی، انبساط اور خمار کا ایک اُبلتا ہوا نکتۂ عروج ہوتا ہے جس کے بعد تلاطم کی لہریں اپنی آخری حد تک پہنچ کر اپنے آپ کو سمیٹتی واپس ہونے لگتی ہیں.. تب ہماری مہربان گائڈ نے ہمیں مخاطب کیا.. سیاح سیر ہو چکے تھے اور تمام شمعیں گُل کر دی گئی تھیں ''خواتین وحضرات آپ سے درخواست ہے کہ اب مکمل خاموشی اختیار کر لیجئے، سرگوشی بھی نہ کیجئے.. دھیان کیجئے، غور سے سنئے.. صحرا آپ سے مخاطب ہوگا.. اُس کی آوازیں سنائی دینے لگیں گی.. کان لگا کر سنئے..''

نیم تاریکی میں روپوش سیاح چوکنے ہو گئے.. اُن کے کانوں کے اینٹنے کھڑے ہو گئے.. ہر آواز، سرسراہٹ اور صحرا کی سرگوشی کو وصول کرنے کے لئے!

اور پھر اُس سناٹے میں صحرا بولنے لگا.. اپنی رنگ رنگ کی بولیاں بولنے لگا.. یہاں سے نزدیک ترین انسانی بستی ایلس سپرنگ پونے چار سو کلومیٹر دور تھی اور وہاں تک جو ویرانے تھے وہ سب کے سب بولنے لگے..

اُس خاموشی میں عجیب بھید بھری، دل میں ہول بھرنے والی فریادیں، کُوکیں اور اجنبی آوازیں سنائی دینے لگیں.. صحرا کی مخلوق ہم سے ہم کلام تھی.. چھپکلیاں، جھینگر، مڈے، زہریلے بچھو اور مکوڑے، شہد کی مکھیاں، باریک چیونٹیاں اور شائد صحرا کی گھاس اور سرکنڈے، جھاڑیاں اور پستہ قامت شجر سُرخ مٹی میں پھوٹنے والے پودے اور اُن کے پتوں پر رینگنے والے چیونٹے.. سب کے سب ہم سے ہم کلام ہوتے تھے، سرسراتے، ٹراتے، رینگتے تھے.. بولتے تھے..

ان آوازوں میں رونگٹے کھڑے کر دینے والی ایک عجیب ڈراؤنی سی آواز کبھی کبھار ''بھوں'' کرتی اور چُپ ہو جاتی، جانے کیا تھا..

صحرا کی بولیوں کی ایک سمفنی تھی جو کبھی مدھم پڑ جاتی اور کبھی یکدم اونچے سُروں میں شور کرنے لگتی..

اور تب اُس لمحے جب ہم سب اگرچہ نیم تاریکی میں ڈوب چکے تھے اور اولورو چٹان کی سُرخ شباہت پس منظر میں نمایاں ہوتی تھی.. خاموشی کی آوازیں سنتے تھے تب مُجھے ایک ملال ہوا.. میرے وطن میں درجنوں نہیں سینکڑوں ایسے مقام تھے جہاں شمعیں گُل کر دیجئے، خاموشی اختیار کیجئے تو فیئری میڈو کے آسمان سے ستارے

گرتے سُنائی دیتے تھے.. دیوسائی کی تنہائی اور بلندی پر ذرا چُپ رہئے تو اس کے بے یقین رنگوں کے پھول بولتے تھے، بھنورے منڈلاتے تھے، ندیوں میں تیرتی مچھلیوں کی تڑپ سنائی دیتی تھی، مارموٹ سیٹیاں بجاتے تھے اور براؤن ہمالیائی ریچھ بھوں بھوں کرتے تھے.. ذرا چُپ رہئے اور سنئے تو سہی کہ.. وادیٔ رُوپل میں نانگا پربت کے شمال کا جو چہرہ ہے وہاں سے کیسے مہیب گڑگڑاہٹ کی پوشیدگی میں برفانی انبار گرتے ہیں، کنکورڈیا کی شب میں، کے ٹو کے بیس کیمپ کی قربت میں، شب بھر گلیشیئر پہلو بدلتے، کڑکڑاتے اور ٹوٹتے دل میں ڈر بھرتے سنائی دیتے ہیں.. وادیٔ شمشال کے اب متروک ہو چکے راستے میں ایک مُرغ زریں پھڑ پھڑاتا اپنے رنگ بکھیرتا جھاڑیوں میں روپوش ہوتا سنائی دیتا ہے، سنولیک کی برفانی دراڑوں میں سے کیسی ہوائیں شُوکتی ہوئی اٹھتی ہیں.. چولستان میں دراوڑ قلعے کی کسی شب میں خاموشی اختیار کیجئے تو وہ صحرا بھی کیسے ہم سے ہم کلام ہوتے ہیں..

اور ہاں ان تمام مقامات پر اگر شیراز کی فراوانی ہو تو بات بن جائے.. بس یہ ہے کہ ہم اپنی خاموشی کی آوازوں کو دنیا بھر میں فروخت نہیں کر سکے.. ہم مذہب کی متعصب اور متشدد افیون فروخت کرنے میں مگن رہے..

ہم خاموشی کی ان آوازوں کو سننے میں اتنے مستغرق رہے کہ ہم نے دھیان ہی نہ کیا کہ آسمان اتنا نیچے آ گیا تھا کہ ہم کسی بھی ستارے کو چھو سکتے تھے، اُسے توڑ کر اپنی جیب میں پوشیدہ کر سکتے تھے..

یہ آسمان اتنا نزدیک آ چکا تھا کہ اُس میں سے نور جہاں کی الوہی آواز میں ایک گیت اترنے لگا..

'' سیّونیں میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا، مینوں ہیر بناون آ گیا.. کتھے لے آیا تیرا پیار سجناں، اج چن تارے نیویں لگدے نیں...''

کہ اے سجن تیرا پیار مجھے کیسے مقام پر لے آیا ہے کہ آج چاند تارے مجھے قریب لگتے ہیں...

نہ صرف آسمان بلکہ اولورو چٹان بھی ہم سے قریب ہوئی جاتی تھی..

ویسے میں نے جان بُوجھ کر اب تک چاند کو چھپائے رکھا تھا..

وہ ہمہ وقت سرخ مٹی کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے صحرا کے آسمان پر میری توجہ کا منتظر تھا..

آج چاند کی تیرہویں تھی اور ابھی اولورو چٹان کا پورا وجود دھوپ سے خالی نہ ہوا تھا جب اُس کا سنہری طشت ابھر آیا تھا..

'' اَج چن تارے نیویں لگدے نیں..''

اس دوران جب ہم سب صحرا کی آوازیں دھیان سے سُنتے محو تھے ایک سمارٹ پروفیسر ٹائپ

ستارہ شناس خاتون کا ظہور ہو گیا جس نے ہمیں متوجہ کرنے کی خاطر ایک مائک کا سہارا لیا اور ہمیں صحرا کی بولیوں اور ستاروں کی قربت کے خواب سے بیدار کر دیا.. اپنا مختصر سا تعارف کروانے کے بعد اُس نے ذرا ڈانٹ کر کہا ''ذرا آسمان کی جانب دیکھئے..''

ہم تو پہلے ہی آسمان کو دیکھ رہے تھے..

''آپ صرف ستاروں کے نام جانتے ہیں، اُن کی تصویریں دیکھتے ہیں.. ذرا دیکھئے وہ آپ کے عین اوپر جگمگا رہے ہیں..''

اُس ستارہ شناس خاتون نے تفصیل سے ہر ستارے کی نشاندہی کی، زمین سے اُن کے فاصلے بیان کئے، اُس کے حجم کے بارے میں بتایا اور ستاروں کا ہماری زندگیوں پر اثر ہوتا ہے یا نہیں اس کی تفصیل سے ہمیں آگاہ کیا..

چونکہ شمعیں گُل ہو چکی تھیں ہم بھی صحرا کی تاریکی میں تاریک ہو رہے تھے اور مُنہ اٹھائے آسمان کو تکتے جاتے تھے اس لئے ہم پر آشکار ہوا کہ ستاروں کی جُھرمٹ میں سے کوئی ایک ستارہ ٹوٹا اور آسمان پر ایک پھلجھڑی کی مانند شرارے چھوڑتا، بھڑکیلے نُوری ذروّں سے آراستہ راستہ تخلیق کرتا، زمین کی جانب لپکتا اوجھل ہو گیا..

''کیچ اے فالنگ سٹار..''

اور وہ جھرمٹ میں سے گرنے والا پہلا ستارہ تھا جو ہماری آنکھوں میں اترا.. وقفے وقفے کے ساتھ ستاروں کے آگے بھی جو جہان تھے اُن میں سے ستارے جو جانے کتنے لاکھوں کروڑوں برسوں سے وہاں موجود تھے، ناموجود ہوتے ٹوٹ کر گرتے رہے.. یہ کوئی غیر معمولی شب نہ تھی، یقیناً ایک معمول تھا، ستارے گرتے ہی رہتے تھے لیکن وہ شہروں اور آبادیوں کے آلودہ آسمانوں میں سے گرتے دکھائی نہ دیتے تھے..

''آپ ایک گرتے ستارے کو دیکھ کر اگر کوئی خواہش کرتے ہیں تو وہ پوری ہو جاتی ہے..'' ستارہ شناس خاتون تاریکی میں سے کلام کرتی تھی ''آپ آسمان کو تکتے جائیے، اگر آپ گرتے ستارے کو دیکھ کر کوئی خواہش نہیں کر سکے تو بس چند لمحے انتظار کیجئے، ایک اور ستارہ صرف آپ کی خواہش کو پورا کرنے کی خاطر ٹوٹ کر گرے گا..''

اور اُس شب اتنے ڈھیر سارے ستارے مسلسل، اپنے آپ میں بھسم ہو کر راکھ ہوتے گرتے گئے کہ شک ہوتا تھا کہ سیاحوں کو بے وقوف بنانے کے لئے اس کا خصوصی طور پر بندوبست کیا گیا تھا لیکن آپ کسی

ستارے کو مجبور نہیں کر سکتے، تابع نہیں کر سکتے کہ تم نے آج کی شب اولورو چٹان کے قریب جو سیّاح آسمان پر نظریں جمائے مبہوت بیٹھے ہیں تم نے عین اُس لمحے گرنا ہے..ایک فالنگ سٹار ہو جانا ہے..ہماری طعام گاہ سے ذرا فاصلے پر صحرائی جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک طاقتور دوربین نصب تھی اور وہ خاتون ہمیں دعوت دیتی تھی کہ آیئے اس دوربین سے آنکھ لگا کر اپنی پسند کا کوئی ستارہ اتنے قریب سے دیکھیے کہ ہاتھ بڑھاؤ تو اُسے چھولو..

اپنے پسندیدہ ستاروں کو اپنے قریب محسوس کرنے کے خواہش مند سیّاحوں کی قطار میں میں بھی شامل ہو گیا..

''سر آپ کونسا ستارہ دیکھنا پسند کریں گے؟''

''مریخ..''

خاتون نے دوربین کے لینز کو گھمایا، فوکس کیا، پھر خود لینز سے آنکھ لگا کر تسلی کی اور پھر کہنے لگی

''آیئے..مریخ چلتے ہیں..''

میں نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کرتے ہوئے دوربین کی آنکھ پر اپنی آنکھ جمائی..دھندلاہٹ تھی، غیر واضح شکلیں تھیں اور پھر وہ سُرخ ستارہ فوکس میں آنے لگا..اُس کے خدوخال اور سُرخ چٹانیں واضح ہونے لگیں..اتنا قریب..اتنا نزدیک..اور میں تو اُس کی سُرخ مٹی پر قدم دھرتا ہوں کہ میں اُس میں سفر کر گیا ہوں..اُس کے نشیب و فراز، سُرخ چٹانیں جیسے میرے منتظر تھے..اور میں نے سوچا کہ مریخ پر کوہ نوردی، شائد میں کبھی کر سکوں..یہ کیا الوہی تجربہ ہو گا، اِس زمین کے علاوہ کسی اور زمین پر خیمہ زن ہونا..اور پھر یہ امکان کہ وہاں زندگی بھی ہو سکتی ہے..اگر میرے پیچھے درجنوں خواہش مند قطار لگائے نہ کھڑے ہوتے تو میں تادیر مریخ میں قیام پذیر رہتا..

چند برس پیشتر میں نے مریخ کی جانب ایک خلائی کیپسول میں بند سفر کیا تھا..جب میرا خلائی جہاز چاند سے ٹکرانے کو تھا تو میں یکے بعد دیگرے دو راکٹ فائر کر کے اُس کے پہلو سے تقریباً ٹکراتا آگے نکل گیا تھا اور جب میں نے مریخ کی سطح پر لینڈ کیا تو بدقسمتی سے میرا خلائی جہاز ایک چٹان پر اتر گیا اور اُس کے بوجھ اور دھچکے سے وہ چٹان متزلزل ہوئی اور ایک کھائی میں گرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میرا خلائی جہاز بھی ڈانواں ڈول ہونے لگا تو مجھے اس خدشے نے آ گھیرا کہ اگر میں یہاں مریخ میں مر جاتا ہوں، سُرخ مٹی میں دفن ہو جاتا ہوں تو میرے رشتے داروں اور دوست احباب کو بے حد پرابلم ہو گی وہ کیسے زمین سے اتنا طویل سفر کر کے میری سُرخ قبر پر فاتحہ پڑھنے آئیں گے..چراغ کیسے جلائیں گے، یا اللہ مجھے اپنی زمین پر ہی مرنا منظور ہے..

مریخ تک کا یہ سفر میں نے ڈزنی لینڈ کے ایک حیرت انگیز شعبدے کے ذریعے کیا تھا.. ہمارا ''خلائی جہاز''.. نہ کہیں گیا نہ آیا.. ہم زمین پر ہی رہے لیکن تکنیکی کمالات نے ہمیں باور کروا دیا کہ ہم مریخ کی جانب سفر کرتے ہیں، وہاں لینڈ کرتے ہیں اور پھر واپس آ جاتے ہیں..

آج یہ ایک سُرخ شب تھی..

سُرخ رنگ کے کرشمے تھے جو ہر جانب جلوہ گر ہوتے تھے..

اُن کشتیوں کے بادبان بھی سُرخ جو میری سُرخ آنکھوں میں سے نمودار ہو کر اولورو چٹان کی جانب رواں ہو کر اُس کے کناروں پر لنگر انداز ہو گئی تھیں..

اور اولورو چٹان بھی سُرخ..

اور چٹان کے آس پاس جو ویرانے تھے اُن کی مٹی بھی سُرخ..

اور اب مریخ کی سرزمین بھی سُرخ جسے دیکھنے سے میری آنکھیں مزید سُرخ ہوتی تھیں..

اَساں اندر باہر لال ہے.. ساہنوں مُرشد نال پیار ہے..

دُھواں دُھنے میرے مُرشد والا، جاں پھولاں تاں لال نیں

لال شہباز قلندر..

مریخ کی سُرخی اپنی آنکھوں میں بھرے جب میں اپنی ڈائننگ ٹیبل کی جانب واپس جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ ڈِنگو ابھی تک وہاں موجود ہے.. تھوتھنی اٹھائے مجھے دیکھتا تھا.. میں نے اُس کے قریب جانے کا خطرہ مول نہ لیا، دور سے ہی پچکارا ''ہیلو ڈِنگو'' ڈِنگو شائد میری پکار کا ہی منتظر تھا، اُس نے اپنی دُم کو ایک خفیف سی لرزش دی اور بُوتھی موڑ کر صحرا کی تاریکی میں اتر گیا.. اگرچہ میں اُس سے باتیں کرنے کا تمنائی تھا، اُسے ہمراز بنانا چاہتا تھا کہ اے ڈِنگو.. بے شک میرے لئے تو ایک ڈبو کُتا ہے لیکن یہ لوگ تمہیں کُتا کہہ کر تمہاری عزت نفس مجروح نہیں کرتے تجھے ڈِنگو بنا دیتے ہیں تو اس صحرائی وسعت میں کیسے زندگی کرتا ہے.. تیرے بچے بھی تو ہوں گے، پیارے سے چھوٹے چھوٹے ڈِنگو ہوں گے تو میں تمہیں اپنا ہمراز بناتا ہوں.. یقین کر میں بھی ایک ڈِنگو ہوں.. ایک بے وطن آوارہ گرد ہوں.. اس جہان کی گلیوں میں بھٹکتا ایک 'ڈبو' ہوں جسے ہر کوئی دھتکارتا ہے.. جس در پر جاتا ہوں سنگ ملامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے.. کوئی نانی جان مجھے ایک چپّہ روٹی کا نہیں ڈالتی، معاشرہ، مذہب کے مداری، یہاں تک کہ خون کے رشتے بھی مجھے قبول نہیں کرتے.. تیرے اور میرے دُکھ سانجھے ہیں..

اگر آپ دنیا کی عظیم ترین سُرخ تنہائی میں ایک شب بسر کرتے ہیں، آپ کے کانوں میں خاموشی

کی آوازیں بولتی ہیں، آنکھوں میں مریخ کی سُرخ چٹانیں نقش ہیں جو کسی بھی لمحے سُرخ بادبانی کشتیوں میں بدل کر اولورو چٹان کی جانب رواں ہو جائیں گی..آپ پر ٹوٹتے ستارے گرتے چلے جاتے ہیں اور آپ نے ڈنر میں کنگرو اور مگرمچھ کھایا ہے..تو پھر کیسے آپ اپنے حواس میں رہ سکتے ہیں، اس لئے آپ ایک ڈِنگو سے باتیں کرنے لگتے ہیں..خود بھی ڈِنگو ہو جاتے ہیں..

اولورو چٹان ابھی ابھی آسمان سے گری تھی، اُس کا سُرخ معبد مدھم مدھم دکھائی دے رہا تھا اور اُس کے کناروں پر میری آنکھوں کی سُرخی سے رنگے بادبانوں والی کشتیاں سیاہی میں ڈوبتی تھیں..

اور تیرہویں کے چاند کا روشن تھال ابھرتا تھا..

؎ اَج چن تارے نیویں لگدے نیں..

○○○○○○

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

''زمین سے پھوٹنے والے بُوٹے جُوتے نہیں پہنتے''

یولارا کی صُبح میں گرم دوپہروں والی چمک تھی..

صحرا کا سُوج کتنی معصومیت سے طلوع ہوتا ہے اور پھر لمحوں میں آگ بگولا ہو جاتا ہے، دہکنے لگتا ہے..

یولارا کی اتنی وسیع تنہائی خوفزدہ کرتی ہے، اگر کسی قدرتی آفت کے سبب، شدید بارشوں، سیلاب کی صورت، ریتلی آندھیوں کی وجہ سے ایلس سپرنگ سے آنے والی سپلائی ٹرین کی شاہراہ مسدود ہو جائے تو پھر کیا ہو؟ ہوائی جہاز بھی نہ اتر سکیں تو پھر کیا ہو.. یہاں کے باسیوں کو خوراک اور دیگر ضروریات زندگی کی باقاعدہ ترسیل نہ ہو تو یہ قصبہ ایک ''گھوسٹ ٹاؤن'' یا ''بُھوت بستی'' میں بدل جائے، ویران ہو جائے، جنگلی جھاڑیاں اور خس و خاشاک تُند ہواؤں میں اڑتے پھریں اور اس کے کناروں پر رُکے ہوئے جنگلی جانور، مکڑے، زہریلے بچھو، ہزار پائے اس پر یلغار کر دیں، راتوں کو ڈِنگو بُوتھیاں اٹھا کر روتے پھریں... اس صورت حال کا امکان تو نہ تھا لیکن یہ واہمہ کبھی کبھار دامن گیر تو ہوتا تھا..

اُس گرم دوپہر والی روشنی سے چمکتی سویر میں ہم ایک آسودہ ریستوران میں ناشتے کے لئے خوراک کا چناؤ کرتے تھے..

میں نے حسب معمول ایک ٹوسٹ، ایک فرائی انڈے، ہیش براؤن آلو اور بیکڈ بینز پر اکتفا کیا، جب ایک ساسیج کو پلیٹ میں منتقل کرنے لگا تو مُونا کہنے لگی ''نہ کھاؤ، پتہ نہیں کیا ہے..''

''لکھا ہے کہ بیف ساسیج ہے..''

''ان کا کیا اعتبار.. احتیاط کرو..''

میں بے اختیار مسکرا دیا ''پچھلی شب تو تم کنگرو اور مگرمچھ سے بھی احتیاط نہ کرتی تھیں اور آج سویر اس غریب سے ساسیج سے پرہیز کرنے کو کہہ رہی ہو..''

وہ بھی مسکرا دی ''پچھلی شب تو خاموشی کی آوازیں سننے کی شب تھی.. ستارے یُوں ٹوٹ کر گرتے

تھے جیسے سُرخ مٹی پر گر کر پھر سے دمکنے لگیں گے اور تم بھی تو اُس بُڑھیا کے ساتھ سگرٹ پیتے بہت چہک رہے تھے..دیر تک کیا باتیں کرتے رہے تھے؟''

''وہ بے چاری تو اپنی خواہشوں کی صندوقچیوں کے بارے میں مجھے بتا رہی تھی اور وہ اتنی بُڑھیا بھی نہ تھی..''

''شیراز کی صرف قُربت نے تمہیں بھی مسرور کر دیا تھا ورنہ وہ تو خاصی گئی گذری تھی اور جب وہ تمہارے سامنے اپنی خواہشوں کی صندوقچیاں کھول رہی تھی تو کیا تم نے بھی اپنی کوئی صندوقچی کھولی، اگر کھولی تو اُس میں کونسی خواہش تھی..''

سلمان ہم دونوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہا تھا..ظاہر یہ کرتا تھا کہ وہ سُن نہیں رہا لیکن وہ اُس مسکراہٹ پر قابو نہیں پا رہا تھا جو اُس کے اب بھی معصوم چہرے پر کوئی بھید پوشیدہ کئے پھیلتی جا رہی تھی..

ناشتے سے اطمینان کشید کر کے ہم سٹی سنٹر کے برابر میں اُس گھاس بھرے میدان میں چلے گئے جہاں ہم نے کل دوپہر ابورجنل آبائی رقص کا تماشا دیکھا تھا صرف اس لئے کہ ہم ''بُوم رینگ'' کا راز جاننا چاہتے تھے..

آسٹریلیا کی کنگرو کے بعد سب سے بڑی پہچان ''بُوم رینگ'' ہے، جسے ابورجنل لوگوں کا سب سے اہم شکار کرنے کا ہتھیار..ایک خمیدہ لکڑی سے تراشا ہوا، نیم قوس شکل کا ایک ایسا ہتھیار جو ایسا تیر نہ تھا جو چل جائے تو واپس نہ آتا تھا، اس کی زد میں شکار نہ آتا تھا تو وہ فضا میں گھوم کر، اباؤٹ ٹرن لے کر واپس شکاری کے ہاتھوں میں آ جاتا تھا..

سبزہ زار کے درختوں کی چھدری چھاؤں میں دو تین درجن پُراشتیاق سیاّحوں کے درمیان میں ایک صاحب.. ہالی وُڈ کے پُرانے زمانوں کے مؤثر اور موٹے اداکار برل آئیوز کے ہم شکل..نیلی پھٹی ہوئی جین، سُرخ ٹی شرٹ اور ایک کاؤ بوائے ہیٹ میں ملبوس ''بوم رینگ'' کے بارے میں لیکچر دے رہے تھے..پہلے تو اُنہوں نے لکڑی کا ایک نیزہ اٹھا کر اُسے شکار پر پھینکنے کا مظاہرہ کیا، پھر اُس شکار کو کیسے ہلاک کیا جاتا ہے..اُس کا گوشت کیسے بُھونا جاتا ہے اس کی بوریت سے بھرپور تفصیل بیان کی، ازاں بعد اُنہوں نے بُوم رینگ بنانے کی تکنیک سے ہمیں آگاہ کیا، کیسے لکڑی کو تراش کر اُسے خم دیا جاتا ہے، ایک قوس کی شکل دی جاتی ہے، پھر اُسے آگ میں رکھ کر مزید خمیدہ کیا جاتا ہے تاکہ لچک پیدا ہو سکے، اُس کا زاویہ کیسے درست کیا جاتا ہے..سیاّح حضرات مُنہ کھولے اتنے انہماک سے برل آئیوز کا بورنگ لیکچر سُن رہے تھے جیسے اُنہوں نے واپس جا کر

اپنی بندوقوں وغیرہ کو تلف کر کے پہلی فرصت میں بُوم رینگ بنانا ہے اور شکار کے لئے نکل جانا ہے.. ہمیں امید تھی کہ برل آئیوز عملی مظاہرہ کرے گا، ایک بُوم رینگ کو ہوا میں پھینکے گا جو گھوم کر پھر سے اُس کے ہاتھوں میں آ جائے گا.. پر ایسا نہ ہوا.. شائد وہ کسی پچھلی کوشش میں ناکام ہو کر شرمندہ ہو چکا تھا، بُوم رینگ واپس نہ آیا تھا..

سلمان نے ایک طویل جمائی لی.. ''سَر جی میں ایئر پورٹ جا رہا ہوں..''

''ہمیں چھوڑ کر سِڈنی واپس جا رہے ہو؟''

''نہیں سَر جی..'' وہ مسکرانے لگا ''میں کوشش کروں گا کہ وہاں سے کوئی کار کرائے پر حاصل کر سکوں تا کہ ہم اولورو راک کے دامن تک جا سکیں، آج کا دن وہاں گذاریں..''

''واقعی..'' میرا خیال تھا کہ ہم صرف دور دور سے ہی اولورو چٹان کا نظارہ کر کے واپس چلے جائیں گے..

''ہاں سر جی.. نہ صرف ہم وہاں جائیں گے بلکہ اس کے گرد ایک مختصر ٹریک بھی کریں گے.. اولورو چٹانوں پر چڑھیں گے.. بس آپ دعا کیجئے کہ کوئی کار دستیاب ہو جائے، یہاں کرائے کے لئے میسر کاروں کی بہت قلت ہے، ایک دو در جن سے زیادہ نہیں.. جو سیّاح صُبح سویرے ایئر پورٹ پہنچ جائے بس وہی حاصل کر لیتا ہے، آپ دعا کیجئے گا..''

ہاں میرا یہی خیال تھا کہ اولورو چٹان کو صرف ایک فاصلے سے ہی دیکھا جا سکتا ہے، اُسے انسانی موجودگی کی آلودگی سے محفوظ رکھا جاتا ہے، تو اس امکان نے مجھے مسرت سے بھر دیا کہ ہم اُس چٹان کے نہ صرف دامن تک جائیں گے بلکہ اُس کے پتھروں کو چھو سکیں گے، اُس کے گرد طواف کر سکیں گے، بشرطِ کہ سلمان کرائے کی ایک کار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے.. برل آئیوز بولے چلا جا رہا تھا اور اُس نے ابھی تک اپنے ہاتھ میں پکڑا بُوم رینگ نہیں چلایا تھا.. ہم چپکے سے اٹھے، سیّاحوں سے الگ ہو کر ذرا ستانے کے لئے اپنی رہائش گاہ کی جانب چلنے لگے تو صحرائی دُھوپ میں وہی کوچ، ابورجنل خاندانوں سے لدی آ کھڑی ہوئی.. وہ حسبِ معمول سیّاحوں کو نظر انداز کرتے سٹی سنٹر کی جانب چلنے لگے..

اور اُن میں وہ بچہ بھی تھا..

''کون ہو تم، جو ہماری ساٹھ ہزار برس کی تنہائی میں،
مُخل ہو گئے ہو..

کون ہو تُم..''

وہ ننگے پاؤں تھا اور مُڑ مُڑ کر مجھے دیکھتا تھا، شائد پہچان کی ایک مسکراہٹ اُس کے موٹے ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لئے نمودار ہوئی..

میں جان چکا تھا کہ سٹی سنٹر میں پہنچ کر بچے آئس کریم خریدیں گے، لڑکیاں کافی بار میں بیٹھ کر برگر کھائیں گی اور پاپ موسیقی سنیں گی، بوڑھی عورتیں اپنے لئے رنگین لباس پسند کریں گی اور مرد.. جب واپس جائیں گے تو اُن کے شاپنگ بیگز میں شراب کی بوتلیں کھنکتی ہوں گی..

یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ دنیا بھر میں جتنے بھی آبائی لوگ اور قبائل ایسے ہیں جو کبھی اپنی سرزمینوں کے وارث تھے، جہاں اب سفید فام لوگوں کا تسلط ہے، وہ سب الکوہلک ہو چکے ہیں، عادی شرابی ہو چکے ہیں، انہیں کینیڈا، امریکہ اور آسٹریلیا میں اب نہ صرف ان کی زمینوں کے اگرچہ معمولی کرائے ادا کئے جاتے ہیں بلکہ اُنہیں اور اُن کی ثقافت کو محفوظ کرنے کے لئے بے شمار رقم بھی مخصوص کی گئی ہے..اور اب اس فراوانی کے باعث وہ کوئی کام نہیں کرتے، امریکہ میں ریڈ انڈین لوگوں کے لئے خصوصی بستیاں ہیں جہاں سیاح اُنہیں ایک عجوبے کے طور پر دیکھنے کے لئے آتے ہیں..الاسکا کے اسکیموہوں یا آسٹریلیا کے ابورجنل، سب کے سب کاہل ہو چکے ہیں، جب کُچھ بھی کرنے کو نہ ہو اور ہر ماہ آپ کی جیب بھر جائے تو شراب پینے کے سوا وہ اور کیا کر سکتے ہیں اور سفید فام اس صورت حال پر مُعترض تو کیا ہوتے اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں..کہ یہ اپنے ماضی کو فراموش کر دیں تو اچھا ہے..علاوہ ازیں وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ دنیا والو دیکھو، ان سرزمینوں کے آبائی باشندے کتنے ناکارہ اور بیکار تھے، اگر ہم ان کی سرزمینوں پر قابض ہو گئے، اُنہیں آباد کر کے تہذیب سے روشناس کروایا تو کیا بُرا کیا.. مجھے الاسکا کے صدر مقام اینکریج میں ٹورسٹ انفرمیشن کے جھونپڑے کے باہر ایک بنچ پر بیٹھا یونہی سامنے سے گذرتی ٹریفک کو دیکھتا، اپنے آپ میں مسکراتا وہ اسکیمو بابا یاد آتا ہے جو مکمل طور پر مخمور تھا، جسے میرا پیش کردہ پاکستانی گولڈ لیف کا سگرٹ بے حد پسند آیا تھا اور اُس نے ایک اور سگرٹ کی فرمائش کی تھی..اُس کا برف کا بنا ہوا اِگلو.. پالتو رینڈیئر..برف پر پھسلنے والی بگھی جسے الاسکن کُتے کھینچتے تھے جس پر سوار ہو کر وہ مچھلی اور سیل کے شکار پر نکلتا تھا، اُس کی برف سلطنت چھن چکی تھی، وہ اپنے آپ کو شراب میں مدہوش نہ کرتا..تو اور کیا کرتا!

وہ بچہ.. ننگے پاؤں، مڑمڑ کے مجھے دیکھتا تھا..

مجھے شک ہے کہ وہ کسی سکول میں زیرِ تعلیم نہ تھا.. یقیناً اُس کے پاس جو گرز ہوں گے جو وہ پہنتا تھا نہ تھا.. جیسے قدیم پنجاب کے باشندے صرف شادی بیاہ کے موقعوں پر جُوتے پہنتے تھے ورنہ ننگے پاؤں ہل چلاتے اور جنگل بیلوں میں گھومتے تھے.. دراصل وہ لوگ جو اپنی دھرتی سے جُڑے ہوتے ہیں، اُس میں جنم لے کر اُسی میں خاک ہوتے ہیں اُنہیں اپنی زمین پر چلنے کے لئے جُوتوں کی حاجت نہیں ہوتی، اُن کی دھرتی ماں اُن کے قدموں تلے بچھتی ہے.. اُنہیں کُچھ آزار نہیں دیتی، اُن کے پاؤں کو چُوم کر ''سوبسم اللہ'' کہتی ہے.. اور وہ کنکروں اور کانٹوں کے خُوگر ہو جاتے ہیں.. وہ اپنے بدن کو براہ راست زمین سے جوڑتے ہیں، اپنے اس رشتے کے درمیان جُوتوں کو حائل نہیں کرتے..

اولمپک کھیلوں کا سب سے داستانوی کردار ایتھوپیا کا مراتھون دوڑ کا سب سے بڑا دوڑنے والا بکیلا.. روم اولمپک میں ننگے پاؤں دوڑا تھا.. بقول اُس کے جب تک اُسے اپنے تلوؤں تلے زمین محسوس نہ ہو، وہ دوڑ نہیں سکتا..

تو ننگے پاؤں چلنے میں کُچھ عار نہیں.. بلکہ اس میں برکت ہے..

رب کعبہ کا دربار ہو یا روضۂ رسولؐ یا کوہ طُور.. ننگے پاؤں، ننگے پاؤں!

وہ بچہ جو مڑمڑ کر مجھے دیکھتا تھا، اس سرزمین کا ایک بُوٹا تھا..

اور زمین سے پھوٹنے والے بُوٹے جُوتے نہیں پہنتے..

○○○○○

''اولورو چٹان میں سے پھوٹنے والے جھرنے..
اور اس کے دامن میں ٹریکنگ...''

ہم اپنی آسائش گاہ کی ٹھنڈک میں استراحت فرماتے جب بہت غافل ہو چکے تھے، بوڑھی ہڈیوں کو آرام دیتے غنودگی کے جھرنوں تلے اونگھتے تھے تو سلمان، غافل تجھے گھڑیال دیتا ہے منادی..گردوں نے تیری عُمر اور گھٹادی..ایک گھڑیال کی صورت ٹن ٹن کرنے لگا ''سر جی آ جایئے، بہترین کار حاصل ہوگئی ہے، آیئے اولورو چٹان کی جانب کُوچ کرتے ہیں..''

ہم ابھی تک نیم بیدار تھے، سفید رنگ کی نِسان یولارا قصبے سے نکل کر ایک سپاٹ اور ویران سڑک پر چلی جاتی تھی..اور یہ وہی سڑک تھی جس پر آپ گم نہیں ہو سکتے تھے، صحرا میں نہ اتریئے تو یہ اولورو چٹان کے گرد گھوم پھر کر واپس آ جاتی تھی، آپ گُم نہیں ہو سکتے تھے..

ہماری ونڈ سکرین پر اولورو چٹان نقش ہونے لگی..کبھی وہ عین سامنے ہمارے قریب آتی ہوئی ایسے محسوس ہوتی جیسے ابھی ہم اس کی چٹانوں سے ٹکرا جائیں گے اور کبھی دائیں جانب اوجھل ہو جاتی..پھر یکدم بائیں جانب نمودار ہو جاتی..

میرے لئے یہ اس سفر کا سب سے ہیجان خیز لمحہ تھا کہ میں اُس سُرخ چٹان کی قُربت کی جانب سفر کرتا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ کیا میری سُرخ آنکھوں میں سے نمودار ہونے والی سرخ بادبانوں کی کشتیاں جو اُس کے دامن میں جا ٹھہری تھیں، کیا ابھی تک وہاں موجود ہیں یا ایک سراب کی صُورت زائل ہو چکی تھیں..

''سلمان..یہ تمہارا آسٹریلیا کیسا ہے..اتنے وسیع ویرانوں کے اندر ہم سفر کرتے ہیں اور ابھی تک یہاں ایک کنگرو بھی دکھائی نہیں دیا..''

''سر جی..اس میں ایک تکنیکی مسئلہ ہے..یہ کنگروؤں کے نمودار ہونے کا وقت نہیں ہے، وہ یونہی سارا دن اچھل کود نہیں کرتے رہتے..یا تو صُبح سویرے خوراک کی تلاش میں نکلتے ہیں یا پھر سرِ شام اپنے مسکنوں کی جانب لوٹتے دکھائی دیتے ہیں..دن کے وقت وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں قیلولہ فرماتے رہتے ہیں، دکھائی نہیں دیتے..ویسے بھی کنگرو آپ سے بے حد ناراض ہیں سر..''

''کیوں ناراض ہیں؟''

''سر جی..کل شب آپ اُن کو کھاتے رہے ہیں..''

سُرخ مٹی میں سے ابھرتا آویزاں ایک بورڈ نظر آیا ''اولورو..کاٹاٹو نیشنل پارک..رُکیے داخلے کا ٹکٹ حاصل کیجیے..''

وہ..داخلے کا ٹکٹ ہم نے رُک کر حاصل کیا اور داخل ہو گئے..

نیشنل پارک میں ذرا دور تک سفر کیا اور ظاہر ہے ہمہ وقت ہماری نظریں اولورو چٹان پر تھیں جو قریب ہوتی جاتی تھی اور یہاں سے ہوش رُبا مناظر کا آغاز ہو گیا، اور یہ اس چٹان کی قدیم عظمت اور دل کو عجیب سی وحشت سے دوچار کرنے والے نظارے تھے..

سڑک سے الگ ایک ''ویو پوائنٹ'' نظر آیا اور ہم اس کی پارکنگ میں چلے گئے..اولورو چٹان اور ہمارے درمیان ابھی فاصلے تو تھے پر کوئی شجر، جھاڑی یا رکاوٹ حائل نہ ہوتی تھی..ہم چہرہ بہ چہرہ، رُو بہ رُو تھے..

عین ممکن ہے اور میں اُن کو دوش نہیں دوں گا کہ میرے پڑھنے والے اس چٹان کے مسلسل تذکرے اور منظروں کے بیان سے اُکتا چکے ہیں لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اُس نوکلومیٹر پتھریلی جھریوں والے چہرے والی چٹان جو دنیا کی سب سے بڑی چٹان کہلاتی تھی، اُس میں کوئی نہ کوئی طلسم، کوئی ایسی کشش ضرور تھی جس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ تشخیص نہیں کی جا سکتی تھی کہ آخر اسے دیکھتے دیکھتے جی کیوں نہیں بھرتا، کوئی نہ کوئی طلسم تھا..

وہ محض ایک چٹان نہ تھی، ایک معبد تھا..

اور ایک معبد سے صرف وہی لوگ اکتاتے ہیں جن کے دل ایمان سے خالی ہوتے ہیں..بے شک ہم اولورو چٹان پر ایمان رکھنے والوں میں سے تو نہیں تھے لیکن ہم اُس کی کشش سے انکار نہیں کر سکتے تھے..جیسے ہم سینٹ پیٹرز، دھرماراجیکا سٹوپا، لوٹس ٹیمپل، انکوروات کے مندروں پر بھی تو ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن دل پر اُن کی اثر انگیزی سے تو انکار نہیں کرتے..

تو یہ جو ازل سے، ساری دنیا سے الگ انانگو لوگوں کی ایک کائنات تھی، بے انت بیاباں،

اجاڑ ویرانے، بے حساب وسعتیں جن میں وہ اور جنگلی جانور اور حشرت الارض اتنے عرصے سے حیات کر رہے تھے کہ ایک دوسرے کے ہم شکل ہو رہے تھے تو اُس کائنات کے درمیان میں یہ سُرخ چٹان اُن کی آنکھوں میں ہزاروں برسوں سے موجود چلی آتی ہے تو اگر وہ لوگ ایمان لے آئیں کہ یہ آسمانوں سے گری ہے، اسے خدا مان کر اس کی پرستش کرنے لگیں تو کیا ہم اُن کے اس سچ پر شک کریں گے.. کیا ہم پر کوئی شک کرتا ہے جب ہم ایک چھوٹی سی چٹان حجر اسود کے بارے میں یقین رکھتے ہیں کہ یہ بھی آسمانوں سے اتری تھی..

یوں جان لیجئے کہ یہ چٹان انانگولوگوں کے لئے ایک کوہِ طُور ہے جس کی چوٹی پر آگ جلتی نظر نہیں آتی پر اُن کا خدا رہتا ہے..

ہر خطّے، ہر قوم اور ہر سرزمین کا اپنا اپنا کوہ طور ہوا کرتا ہے.. ہر کوئی اپنی حیات، تاریخ اور موسموں کی مطابقت سے اپنا اپنا کعبہ تعمیر کرتا ہے..

ہم اتنے محو تھے کہ ہمیں احساس بھی نہ ہوا کہ ہم سے کُچھ فاصلے پر ایک خلائی لباس میں ملبوس شخص ایک دیوزاد سیاہ موٹر سائیکل سے ٹیک لگائے اولورو چٹان پر نظریں جمائے، ایک بے خبری کی حالت میں جانے کب سے کھڑا ہے..

موٹر سائیکل کے آہنی بدن پر اُن درجنوں ممالک کے پرچم چسپاں تھے جو اُس کی مسافتوں کے درمیان آئے تھے اور اُن میں.. ہمارا پرچم.. یہ پیارا پرچم، پاکستان کا بھی تھا..

میں نے قریب ہو کر جب اُسے ''ہیلو'' کہا تو وہ چونک گیا۔ وہ چٹان کو دیکھنے میں اتنا غرق تھا ''میں دیکھ سکتا ہوں..'' میں نے پاکستانی پرچم کی جانب اشارہ کیا ''کہ آپ پاکستان کے راستے یہاں تک پہنچے ہیں.. میں بھی پاکستان سے ہوں..''

''واقعی؟'' وہ اولورو کے سحر سے باہر آ گیا ''میں ایران کے راستے پاکستان میں داخل ہوا تھا اور بلوچستان میں امن نہ تھا.. پاکستانی حکومت نے صرف میری حفاظت کی خاطر ایک محافظ دستہ میرے ہمراہ کر دیا جو مجھے ملتان تک چھوڑنے آیا.. اگرچہ میں تو کوئی خطرہ محسوس نہ کرتا تھا، بلوچ لوگ بے حد مددگار اور مہمان نواز تھے، البتہ وہ آسانی سے خونخوار ہو جاتے تھے جب میں کسی مجبوری کے تحت اُن کے کھانے کی دعوت قبول نہ کرتا تھا.. تو میں قبول کر لیتا تھا.. اُنہوں نے مجھے ایک پورا روسٹ بکرا کھلانے کی کوشش کی.. ونڈر فُل پیپل..'' وہ خوشدلی سے ہنسنے لگا.. ''ویسے میں آپ کو بتاتا ہوں بلوچستان کے ویرانے اور چٹانی مناظر، اولورو راک سے کہیں زیادہ دل کش ہیں..''

''آپ جرمن ہیں؟'' اُس کی انگریزی میں جرمن لہجے کا بھاری پن تھا..

''نہیں میں سوئٹزرلینڈ کا ہوں، برن میں رہتا ہوں.. شائد آپ نے اس شہر کا نام سُنا ہو..''

''ہاں..''میں نے صرف اتنا کہا..میں کیسے اُسے بتاتا کہ برن ہی پیار کا پہلا شہر ہے..کیسے اُسے اِس راز میں شریک کر لیتا کہ جپسی برن میں رہتی تھی..

''اب کیا ارادے ہیں؟''

''میں ایلس سپرنگ سے آ رہا ہوں..دو تین روز اولورو راک کے دامن میں خیمہ زن ہوں گا..ایک سِوس ہونے کے ناتے مُجھے پہاڑوں اور چٹانوں سے عشق ہے تو میں اِس راک کو کلائمب کرنے کی کوشش کروں گا اور پھر..کوئی طے شدہ منصوبہ نہیں ہے، جانے کدھر کو نکل جاؤں..'' وہ پھر سے چٹان کے گیان دھیان میں گُم ہو گیا..ہم سے بے خبر ہو گیا..

OOOOOO

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

''گنگا کے پانی..ایک قدیم تالاب...زمزم کے پانی''

صحرا کو روندنے کی اجازت نہ تھی، کیڑے مکوڑوں، چھپکلیوں، ٹڈوں اور اُس میں سے پھوٹنے والے بُوٹوں اور گھاس پر چلنے کی ممانعت تھی ورنہ جی چاہتا تھا کہ کار ترک کر کے صحرا میں اتر جاؤں اور اولورو راک تک پیدل چلتا جاؤں..ایک سیاحتی کتابچے میں درج تھا کہ اگر آپ متعینہ راستے ترک کر کے صحرا میں چلنے لگتے ہیں تو اُس کی کنوارگی پر اپنے جوگرز کے نشان ثبت کرتے جاتے ہیں تو وہ کیسے بدنما داغ ہوں گے.. اس لیے صحرا کے اندر قدم مت رکھئے..

ہم پھر سے سفر کے فقیر ہوئے، اپنا کشکول اولورو چٹان کے منظر کے سامنے پھیلائے اپنی کار پر اُس کی جانب رواں ہوئے..

وہ قریب ہوتی گئی..

اتنی قریب کہ ونڈسکرین پر حاوی ہوگئی..اُسے یوں بھر دیا کہ سوائے اُس کی سرخی کے اور کُچھ نظر نہ آتا تھا اور گمان ہوتا تھا کہ جیسے اُس کا سنگلاخ سُرخ بدن ابھی ونڈسکرین کو پاش پاش کر کے اُمڈتا ہوا ہم پر آ گرے گا..

اولورو راک آ گئی، اُس کی پہلی چٹان ہمارے برابر میں سے ابھری اور ہم پھر آگے جاتے گئے..ہم اُس کے پہلو میں، اُس کے دامن میں، جب کہ وہ ہم پر سایہ فگن ہوتی تھی نہایت مدھم رفتار میں چلتے گئے.. ویسے اگر اُس لمحے کوئی شخص دور سے اس منظر کو دیکھتا تو اُسے اولورو کے کناروں پر رینگتی ایک ایسی نسان کار نظر آتی جو اگرچہ سفید تھی لیکن اب اولورو کی سُرخی اُس پر حاوی ہو رہی تھی، وہ سُرخ دکھائی دینے لگی تھی..ایک بیر بہوٹی کی مانند اُس کے دامن میں رینگتی چلی جاتی تھی..وہ شخص اگر اُس کار کے اندر جھانک سکتا تو اُسے وہاں سلمان ایک سُرخ بھالو نظر آتا، میمونہ جیسے نکاح کے دن سُرخ جوڑے میں ملبوس تھی، اور میں..میرے خزاں رسیدہ چہرے کے جنگلوں میں اشوک شجر کے قدیم سُرخ پھول کھلے ہوتے..اگر وہ کار کے اندر جھانک سکتا تو!

''یہاں رُکنا ہے؟'' میں پُوچھتا..

''نہیں..'' سلمان کہتا..

''کیوں نہیں..'' میں ہر مقام پر رُکنا چاہتا تھا..

پھر ہماری کار دھوپ میں سلگتی مٹی پر اپنے ٹائروں کے نشان ثبت کرتی ایک ایسے مقام پر رُک گئی جسے ہم اولورو چٹان کا بیس کیمپ کہہ سکتے ہیں..

میں اور سلمان کار سے باہر آئے تو پہلے اولورو چٹان کی سُرخ ہیبت ہم پر حاوی ہوئی اور پھر کم از کم دو تین درجن نہایت متناسب ٹانگیں.. یعنی لڑکیوں کی.. سرخ مٹی میں سے جیسے ابھی ابھی اُگ آئی ہوں اُن کے حُسن نے ہمیں تسخیر کرلیا..

دراصل سیاحوں کے ایک گروپ کو چٹان کے دامن میں اُن کا گائڈ اس کی تاریخ اور داستانوی حیثیت کے بارے میں بھاشن دے رہا تھا اور وہ سب چٹان کی جانب چہرے کئے ہوئے تھے اور اُن میں سے بیشتر خواتین تھیں اور وہ بھی مُنہ موڑے کھڑی تھیں تو ہمیں اشتباہِ نظر یہی ہوا کہ سرخ مٹی میں سے سفید متناسب ٹانگیں پُھوٹ نکلی ہیں، اور وہ نہایت لامی اور دھوپ کی شدت سے اشتعال انگیز حد تک سُرخ ہو رہی تھیں..

یہاں وہ کیوبن سٹائل کا براؤن نہایت سٹائلش ہیٹ کام آ گیا جو میں نے میامی میں خریدا تھا، دُھوپ سے بچاتا تھا..

ویسے مُونا کو اس پہناوے کے بارے میں کُچھ تحفظات لاحق تھے.. اُس کا کہنا تھا کہ یہ چُرمر ہیٹ پہن کر میں ایک مسخرہ، ایک پلپلی صاحب لگتا تھا.. لیکن مُجھے ایک مسخرہ یا پلپلی صاحب ہونا منظور تھا، اولورو راک کی تپش اور دھوپ کی شدت سے مجھے ننگے سر سن سٹروک کروانا منظور نہ تھا..

ہم نے اس چٹان کو پچھلی شب غروب کے منظروں میں اترتے دور سے دیکھا تھا اور اب اُس کے چٹانی چہرے سے اپنا چہرہ جوڑے دیکھتے تھے تو یہ کوئی اور چٹان تھی، وہ نہ تھی جسے ہم نے دور سے دیکھا تھا..

بے شک اجتناب اور دُوری میں ایک رومان ہوتا ہے لیکن قُربت کے وصل کے ذائقے جُدا ہوتے ہیں.. بدن کے بھید قُربت سے ہی کُھلتے ہیں..

چٹان کی چوٹی تک ایک راستہ بلند ہوتا دکھائی دیتا تھا، ایک ریلنگ تھی جسے تھام کر اوپر تک پہنچا جا سکتا تھا اگرچہ اُس راستے پر اگر پاؤں بہک جائے تو نیچے چٹان سے ٹکرا کر موت یقینی بھی ہو سکتی تھی..

میں موت کی متعدد پگڈنڈیوں پر چل چکا تھا.. ذرا سی پاؤں کی لرزش اور ایک کلومیٹر گہرائی میں دریائے برالڈو کے پانی آپ کو دفن کرنے کے لئے شور کرتے ہیں.. کسی گلیشیئر کے کناروں پر اگر قدم پھسل

جائے تو بہت گہرائی میں اُس کی ہولناک گونج آپ کی آمد کی منتظر..لیکن تب بدن میں توازن اور نصیب ساتھ دیتا تھا''باک سرائے''،''کے ٹو کہانی'' اور''سنولیک'' کی کوہ نوردی کے دوران کئی ایسے مقام آئے جو مقامِ آخرت بھی ہو سکتے تھے لیکن تب توازن تھا..اور اب نہیں تھا..

اگر میں دس برس پیشتر یہاں آتا وہ وحشی سانڈھ بھی مجھے اولورو چٹان پر چڑھنے سے نہ روک سکتے..

سلمان نے میری ہمت بندھائی''سر جی..اولورو چٹان کے دامن میں ذرا دیکھئے اس کے پہلو میں ایک راستہ ہے..ہم نہیں آپ کچھ ہمت کریں تو ہم چٹان کے گرد ایک مختصر ٹریک کر سکتے ہیں..''

تیز دھوپ تو تھی اور عُمر بھر کی مسافت کی تھکن تو تھی پر حرص جُوں کی تُوں تھی..میں نے کہاں اس چٹان سے دوبارہ میل کرنا تھا، روز روز کہاں آنا تھا، میں راضی ہو گیا..براؤن ہیٹ کے سہارے کہ یہ مجھے سن سٹروک سے بچا لے گا، رضامند ہو گیا..

میمونہ نے اس مختصر مُہم میں شمولیت سے صریحاً انکار کر دیا''تم ہو آؤ..''اور اپنے دوپٹے کا گھونگھٹ اوڑھ کر ایئر کنڈیشنڈ کار میں استراحت فرما گئی..سلمان سے میں نے درخواست کی کہ ہم چلتے ہیں، پر ہولے ہولے چلتے ہیں..یُوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر..سر پہ خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں..تو پھر ایک پلپلی صاحبوں والا چُرمر ہیٹ ہی لے چلیں..

تو ہم چل دیئے..

اولورو چٹان کے گرد ایک معصوم سی کوہ نوردی کا آغاز ہو گیا..کہیں درختوں کے سائے راستے پر اترتے تو ہم چھاؤں میں ٹھہر کر دھوپ کی شدت سے کچھ دیر کے لئے پناہ حاصل کر لیتے..

میں مُنہ اٹھا کر چٹان کی قربت کو محسوس کرتا اور پھر ایک ہیجان میں مبتلا ہو کر زقندیں لگاتا، نزدیک ترین چٹانوں پر چڑھتا، اولورو سے ہم آغوش ہو جاتا..سلمان کہتا رہتا کہ سر جی..واپس آ جائیں، گر جائیں گے..پر سر جی کہاں ہوش میں تھے..بلکہ ایک مرتبہ راستے سے الگ ہو کر جب میں اولورو چٹان کی چٹانوں پر چڑھتا، اُن کے درمیان جو شگاف تھے، اُن کو عبور کرتا خاصی بلندی پر پہنچ گیا تو میں نے اپنا پلپلی ہیٹ اتار کر اُسے فضا میں لہرایا..جیسے میں چٹان کی چوٹی پر پہنچ گیا ہوں اور بہ آواز بلند نیچے کھڑے حیران پریشان سلمان سے درخواست کی کہ..فوٹو کھینچ ادئے..

ہم نے تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ چٹان کے دامن میں سفر کرتے طے کیا اور اس دوران ہمیں کچھ انعام ملے..

ہماری آمد سے پیشتر ان صحراؤں میں شدید بارشیں آسمانوں سے اتری تھیں..سُرخ مٹی ابھی تک

گیلی تھی اور اُس میں سے پھُوٹتے بُوٹے نومولود اور کچے سبز رنگت کے تھے..

اُن بارشوں کے بہت سے پانی بہہ چکے تھے..

لیکن.. چٹان کی دراڑوں، گھاٹیوں، گڑھوں اور گہرائیوں میں ابھی تک بارش کے کُچھ پانی موجود تھے اور وہ ان دراڑوں میں سے رِستے، راستے بناتے جھرنوں کی صُورت گرتے دکھائی دے رہے تھے، چٹان کے سُرخ سنگلاخ وجود میں سفید دھاریاں نمودار ہوتی تھیں، مختصر آبشاریں گرتی تھیں اور یہ صرف اولورو کے قریب ہونے کے کرشمے تھے ورنہ یہ ذرا سے فاصلے سے بھی دکھائی نہ دیتی تھیں.. جب میں نے اور میں ہمہ وقت چلتے ہوئے مُنہ اٹھائے چٹان کے نشیب و فراز پر نظریں رکھتا تھا.. تو جب میں نے پہلا جھرنا دیکھا، سُرخ چٹان میں سے پھُوٹتا ایک سفید ریشم ایسا جھرنا دیکھا تو مسکراہٹ ایک ہیجان آمیز مسرّت کی میرے ہونٹوں پر پھیل گئی، میرا چہرہ اس معجزاتی منظر سے دمکنے لگا.. چٹان کا یہ رُوپ بہت کم لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے..

اولورو چٹان کی ایک شہرہ آفاق تصویر ہے جو فوٹو گرافر سٹیو سٹرائک کے کیمرے میں ہمیشہ کے لئے منتقل ہو گئی..

شدید دھواں دار مسلسل بارشوں کے فوراً بعد آسمان پر ابھی تک بادل ٹھہرے ہوئے ہیں اور چٹان کی سُرخیوں اور سنگلاخیوں کی دراڑوں میں سے درجنوں آبشاریں، پانیوں کے سفید ریلے گر رہے ہیں..

اولورو چٹان پر پانی ٹھہر نہیں سکتے، وہ راستے بناتے آبشاروں اور جھرنوں کی صورت گرتے چلے جاتے ہیں..

عجیب جادوئی منظر ہے جیسے چٹان ایک جھرّیوں بھری ہتھیلی ہو جس میں سے قسمت کی سفید ریکھائیں آبشاروں کی صورت نمایاں ہو رہی ہوں..

ہم نے اُس شب جب کُچھ سیاحوں سے تذکرہ کیا کہ آج اولورو کے گرد ٹریک کرتے ہوئے ہم نے چھوٹی چھوٹی آبشاریں اور جھرنے گرتے دیکھے ہیں تو وہ یقین نہ کر سکے.. اُن کا کہنا تھا کہ وہ بھی آج سُرخ چٹان کے آس پاس گھومتے پھرتے رہے ہیں لیکن اُنہوں نے وہاں کوئی آبشار گرتی یا جھرنا پھُوٹتے نہیں دیکھا تھا.. تو کیا آسمان سے گری ہوئی اُس چٹان نے ہمیں ایک خصوصی الوہی انعام سے نوازا اور اپنے وجود میں ابھی تک محفوظ پانیوں کے بند کھول کر چند لمحوں کے لئے آبشاروں اور جھرنوں کو جنم دیا صرف اس لئے کہ وہ پہچان گئی تھی کہ تمام سیاحوں میں سے یہ ایک ایسا شخص ہے جس نے مجھے دیکھنے کے لئے سب سے طویل سفر اختیار کیا ہے، یہ دور دیسوں سے آیا ہے اسے ایک انعام سے نواز دو.. دراصل اُس دوپہر دھوپ کی شدت اور گرمی کے

باعث سوائے دو سیاحوں نے اولورو کے گرد اُس کچے راستے پر جو چٹان کے پہلو میں سے چلا جاتا تھا، چلنے کا خدشہ مول نہ لیا تھا.. اُن دو کے سوا صرف ہم چلے تھے اس لئے وہ منظر ہمارے نصیب میں آ گیا.. یہ طے نہیں ہے کہ اولورو چٹان چٹان کو کس باہر سے آنے والے شخص نے پہلی مرتبہ دریافت کیا، البتہ سونے کی تلاش میں اولورو کے دامن میں پہلا جہاز 1930ء میں اترا.. 1940ء میں ایلس سپرنگ سے یہاں تک سڑک تعمیر کی گئی اور بالآخر ابورجنل کی خصوصی اجازت سے کہ یہ سرزمین اُن کی ملکیت تھی، یولارا کا یہ قصبہ 1970ء میں وجود میں آیا تا کہ باہر کی دنیا بھی یہاں آ کر اس سُرخ چٹان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے..

ہم چلتے جاتے تھے، گرمی کے ساتھ میری ہوس بھی بڑھتی جاتی تھی کہ ذرا تھوڑی دور اور چلوں، اُس جھاڑی تک، اُن درختوں تک، اُس سنہری گھاس تک اور پھر لوٹ چلیں گے اور جب وہاں پہنچتے تو سلمان پُوچھتا ''سر واپس چلیں'' تو میں کہتا.. ''بس اُن جھاڑیوں تک.. اُن بکھری ہوئی چٹانوں تک..'' اور ہم چلتے جاتے اور چٹان بھی سلگ رہی تھی اور دُھوپ کی تپش بھی بدن میں سے نمی کا آخری قطرہ چُوس رہی تھی اور میں سلمان کے تھیلے میں جو منرل واٹر کی بوتلیں تھیں اُن کو خالی کرتا جاتا تھا جب مجھے محسوس ہوا کہ یہ میں نہیں، کوئی اور ہے جو اولورو چٹان کے گرد چلتا جاتا ہے، ہوش میں ہوں لیکن یہ میں نہیں، میرا کوئی ہم شکل ہے جو سُرخ مٹی کے اس راستے پر چلتا جاتا ہے.. اور اُس نے بھی ایک براؤن رنگ کا چُرمر ہیٹ پہنا ہوا ہے.. تو کیا میں ایک خواب میں ہوں.. ایک فریبِ نظر، تصوّر کے دھوکے میں ہوں، ایک خواب میں ہوں کہ جہاں میں سرگرداں تھا، یہ خوابوں پر ایمان رکھنے والی صحرائی کائنات تھی..

ابورجنل لوگوں کے مختلف قبائل ہیں جن کے اپنے اپنے مزاج، ثقافت اور زندگی کرنے کے ڈھنگ ہیں لیکن ان سب کے درمیان ''خواب'' مشترک ہیں.. خواب، یقین ہیں، علم ہیں، تعین کرتے ہیں کہ زندگی کیسے بسر کی جائے، کونسے اصولوں پر عمل کرنا ہے اور جو اِن سے روگردانی کرتا ہے اُسے سزا ملتی ہے.. یہ سب ابورجنل لوگوں کا آبائی عقیدہ ہے.. وہ بچّوں کو اپنے خوابوں کی کہانیاں سناتے ہیں، انہیں بتاتے ہیں کہ اُن کی سرزمین کیسے وجود میں آئی، کیسے آباد ہوئی اور اُن کی حیثیت اس ویرانے میں یہ ہے کہ وہ اس کے نگہبان ہیں، اُنہیں اپنے قدیم مسکن کا خیال رکھنا ہے..

اور آج بھی ابورجنل لوگ خوابوں میں زندگی بسر کرتے ہیں..

لیکن وہ ن۔م۔راشد کی مانند خواب فروش نہیں ہیں کہ ؎ خواب لے لو خواب.. ورنہ وہ کب کے گورا لوگوں کے ہاتھوں اپنے خواب فروخت کر کے بے رُوح ہو چکے ہوتے..

؎ خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کا دکھانا مُشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے، ہاتھ لگانا مُشکل ہے

ابورجنل لوگوں کے خواب آئینوں میں جو پھول کھلتے ہیں وہ اُن کو ہاتھ لگا سکتے ہیں، اُنہیں چھو سکتے ہیں کہ وہ بھی تو خود اُس آئینے کے اندر حیات بسر کرتے ہیں..

کیا ایسا تو نہیں کہ میں بھی ایک ابورجنل ہوں، اپنے قدیم مسکن کو لوٹ آیا ہوں کہ میں نے بھی تو خوابوں کو ایمان بنائے زندگی بسر کی..البتہ میں بے ایمان ہوا اور اپنے خوابوں کو اپنے سفرناموں اور ناولوں کی صُورت میں فروخت کر دیا اور اب میرے پلّے میں کچھ بھی باقی نہیں ہے..سوائے کچھ راکھ کے..کچھ خس وخاشاک کے..میں تہی دامن ہو چکا ہوں..خواب لے لو خواب..

ہم بالآخر واپس ہوئے، تقریباً تین کلومیٹر کے طواف کے بعد واپس ہوئے تو اُس پارکنگ لاٹ کی سُرخ مٹّی پر..کڑی دھوپ میں صرف ایک نِسان سفید کار کھڑی تھی جس کے اندر کی ٹھنڈک میں مُونا بیگم اپنے دوپٹے کا گھونگھٹ اوڑھے محوِ خواب تھی..یعنی وہ بھی خواب میں تھی..

oooooo

''کاٹا ٹوٹو کے غروب میں چودھویں کا چاند اُبھرتا ہے''

ہم پھر سے اولورو کے دامن میں مائلِ سفر ہوئے..

جہاں کہیں کوئی وِیو پوائنٹ ہوتا ''قابلِ دید'' منظر کا بورڈ آویزاں ہوتا، ہم ٹھہر جاتے اور دید کے بعد پھر سے سفر کرنے لگتے..

اور پھر ایک اور بورڈ نظر آیا کہ ادھر چٹان کے دامن میں ایک مقدّس تالاب ایک ''واٹر ہول'' ہے.. جب اولورو چٹان وجود میں آئی تو اُسی لمحے یہ تالاب بھی ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں سے بھر گیا..آپ کو یہاں سے پیدل جانا ہوگا..

چنانچہ ہم نے کار پارک کی اور کڑی دھوپ میں پیدل چل دیئے..ایک مختصر فاصلے کے بعد درختوں کی چھاؤں گھنی ہوگئی..اُن کے درمیان میں سُرخ مٹّی کا راستہ بچھا ہوا تھا..

اور پھر چٹانوں کی آغوش میں اُس تالاب کے پانی دھوپ کی کرنوں میں دمکتے تھے،سطحِ آب پر دُھوپ آگ لگاتی تھی اور اُس میں سے سفید رنگ کے انار چُھوٹتے تھے..اُنہیں دیکھا نہ جاتا تھا،اس قدر وہ پانی لشکتے تھے،آنکھیں چندھیاتی تھیں..

تالاب کے چاروں اور چٹانوں کی دیواریں تھیں..اور اُس کے پانی دمکتے تھے..اور وہ تب سے تھے جب یہ چٹان وجود میں آئی تھی،کم از کم ساٹھ ہزار برس سے..اس ''واٹر ہول'' یا تالاب کے بارے میں ابورجنل داستانیں ہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں کہ یہ ان وسیع بیابانوں میں، پیاسی کائناتوں میں واحد پانی کا ذخیرہ ہے،ایسا تالاب ہے جہاں وہ جو مسافر ہوا کرتے تھے،وہ یہاں پہنچ کر اپنی پیاس بجھاتے تھے.. پیاس کے بے انت صحرا میں یہ واحد نخلستان تھا..اس کے پانیوں میں شفا تھی، یہ مقدّس پانی تھے..

مُجھے خواہش ہوئی کہ میں جُھک کر اس تالاب میں سے دو گھونٹ پانی کے پی لوں لیکن مُونا نے منع کر دیا ''بہت آلودہ اور گدلے پانی ہیں.. یقیناً ان میں رَکر لے..چھپکلیاں اور ڈِنگو وغیرہ تیرتے رہتے ہوں

گے.. منرل واٹر کومنہ لگالو..''

وہ آگاہ تو تھی کہ میں کیوں اس تالاب میں سے دو گھونٹ پانی کے پینا چاہتا ہوں.. تاکہ میں محسوس کر سکوں کہ آج سے ہزاروں برس پیشتر جب کوئی انانگو مسافر اس تالاب سے اپنی پیاس بجھاتا ہوگا تو یہ پانی اُس کے پیاسے حلق سے اترتے ہوئے کیسے ذائقوں اور زندگی بخش ٹھنڈک سے روشناس کرواتے ہوں گے..

یہ تالاب ہزاروں برس سے جُوں کا تُوں موجود تھا.. خشک نہ ہوا تھا.. اولورو چٹان کے اندر شائد کوئی چشمے تھے جو اسے سیراب کرتے تھے تو کیا ہم اسے انانگو لوگوں کا چاہِ زمزم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے پانیوں میں بھی تو شفا تھی..

ہر خطّے اور سر زمین کے ایمان الگ.. یقین جُدا، خدا بھی اپنے، شفا دینے والے پانی بھی اپنے.. کہیں گنگا، کہیں دریائے اُردن، کہیں زمزم اور کہیں.. اولورو کے دامن میں پوشیدہ اس تالاب کے پانی..

یقین کامل ہو تو کسی بھی پانی کا ایک گھونٹ بھر لو، شفا اُسی میں ہوگی..

کسی ایک رنگ کو مسلسل دیکھ دیکھ کر ایک عام انسان رُکتا جاتا ہے.. لیکن اگر ایمان اور عشق کی شرابیں یکجا ہو جائیں تو کسی ایک رنگ کو دیکھ دیکھ کر زندگی بھر جی نہیں بھرتا.. بلکہ انسان اُسی رنگ میں رنگا جاتا ہے.. میرے لئے وہ رنگ روضۂ رسولؐ کے گنبد کا سبز رنگ ہے.. یہ مختصر زندگانی تو کیا ایسی ہزاروں زندگیاں نصیب ہوں تو بھی اُسے دیکھ دیکھ کر جی نہ بھرے.. آنکھیں اُس سبز گنبد پر گئیں تو آج تک واپس نہیں آئیں، وہیں بسیرا کر لیا.. کبوتروں کے ساتھ غٹرغوں کرتی واپس آنے سے انکاری ہو گئیں.. اس لئے آج تک کُچھ نظر نہ آیا.. آنکھیں ہی نہیں تھیں..

کُچھ اسی طور اولورو چٹان کی یک رنگی میں بھی یہی کشش تھی..

اسے دیکھ دیکھ کر آنکھیں اُکتاتی نہ تھیں..

اور میری آنکھیں تو پہلے سے ہی ناموجود تھیں.. سبز گنبد کے کبوتروں کے ہمراہ غٹرغوں کرتی تھیں لیکن ان آنکھوں میں سے وہ سُرخ بادبانوں والی کشتیاں نمودار ہوئی تھیں جو اولورو چٹان کے کناروں پر لنگر انداز ہو گئی تھیں..

وہ کشتیاں کہاں تھیں؟

○○○○○○

''میں نے بوڑھے ابورجنل شکاری کو خرید لیا''

دوپہر ڈھلنے لگی..اولورو کے سُرخ سمندر پر سائے اترنے لگے..ہم چٹان کے دامن میں واقع ایک ویران کلچرل سنٹر کے قریب ایک جھونپڑے کی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور وہاں سلمان نے ایک نہائت شاندار دعوت شیراز نہیں، دعوتِ اولورو کا اہتمام کیا...مشروبات، سلاد کے پیکٹ، برگر، روسٹ چکن، آلو کے قتلے اور جانے کیا کیا..

کھانے سے شادکام ہوئے تو سلمان کہنے لگا''سُر جی..اب آپ کی خواہش کیا ہے؟''

''میں اس اولورو چٹان سے اب عاجز آ چکا ہوں...بہت تھک چکا ہوں تو مُجھے واپس اپنے آشیانے میں لے چلو..میں''چھپکلی کیفے'' میں گرم کافی کا ایک پیالہ پی کر..آرام کروں گا..''

''سُر جی..آپ تھوی سی ہمّت کریں..ہم یہاں سے نکل کر صرف چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع کاٹاٹوٹو چٹان کے انبار تک پہنچیں اور..کہتے ہیں کہ جب ان چٹانوں پر سُورج غروب ہوتا ہے تو اُن میں آگ لگ جاتی ہے..بندہ پاگل ہو جاتا ہے..چلیں؟''

''یار گرمی سے میرا دماغ پگھل چکا ہے..میں کسی بھی لمحے ڈھیر ہو سکتا ہوں اور میں مزید پاگل نہیں ہونا چاہتا..گھر چلتے ہیں..''

سلمان مُجھ سے خفا ہو گیا.. مُنہ موڑ کر بیٹھ گیا، روٹھ گیا..''سُر جی پلیز..''

ooooo

''اولورو چٹان پر کرنیں کمندیں ڈالتی اُس کی چوٹی کو سر کرتی ہیں سورج طلوع ہوتا ہے''

ہم اولورو چٹان کے گرد لپٹی ہوئی سڑک پر گھومتے اُس کے مدار سے باہر آ گئے اور کاٹا ٹوٹو کی جانب ایک ویرانے میں سفر کرنے لگے جہاں ایک آسیب کی مانند ڈھلتے سائے بچھے جاتے تھے..

بے عیب، ہموار سڑک، جس پر ایک اکلوتی سفید نِسان کار تھی، چلی جاتی تھی.. اور اُس کے دونوں جانب ایک بے عیب اَن چُھوا صحرا دور دور تک لیکن بے آب و گیاہ نہیں، جھاڑیوں اور جنگلی گھاس سے آراستہ.. لیکن میری تسلی نہ ہوتی تھی کہ یہ کیا کہ آپ اناگو کی قدیم سرزمین پر ہیں اور وہاں کوئی ایک بھولا بھٹکا کنگرو بھی نظر نہیں آ رہا.. سلمان نے جو تجزیہ پیش کیا تھا برائے کنگرو آں.. کہ وہ یا تو صُبح سویرے خوراک کی تلاش میں نکلتے ہیں یا پھر شام کو اپنی پناہ گاہوں سے باہر آ کر اچھل کُود کرتے ہیں، باطل ثابت ہو گیا تھا.. اس ویرانے کو کنگروؤں سے بھرنے کی ایک ہی ترکیب تھی، آپ اپنے تصور میں مختلف سائز کے پانچ چھ کنگرو تخلیق کیجئے اور پھر اُنہیں اس بے انت بیاباں میں کُھلا چھوڑ دیجئے.. وہ نہ صرف آپ کی کار کے آس پاس کُودنے لگیں گے بلکہ آپ کے حُکم کے تابع بھی ہوں گے کہ آپ کے تصور کے ہی تو کنگرو ہیں..

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی اور کنگرو بھی نہیں تھے..

دائیں جانب کُچھ ٹیلوں کے پار کاٹا ٹوٹو کی چٹانوں کا انبار نظر آنے لگا.. اور وہ کوئی متاثر کرنے والا نظارہ نہ تھا.. لیکن جب ہم قریب ہوئے اور اُن کی سرخ ہیبت آنکھوں میں اتری تو ہم نے جانا کہ یہاں تک کا سفر رائیگاں نہیں گیا..

کاٹا ٹوٹو یا اولگار چٹانیں سُرخ مٹی میں سے جنم لیتی چٹانوں کی عجیب شکلیں تھیں.. ابورجنل لوگوں نے انہیں کاٹا ٹوٹو کا نام دیا یعنی ''کئی سروں والی چٹانیں'' یا ''کئی شکلوں والی چٹانیں'' جیسے ناگا پربت ''شل مکھی''

ہے..سینکڑوں چہروں والا پہاڑ تو اسی طور کا ٹاٹوٹو..

مجھے گمان تھا کہ ہم یہاں ایک دشت تنہائی میں ہوں گے..گلیاں سُونی ہوں گی اور اُن میں ہم مرزے یار پھریں گے لیکن وہاں تو خوب رونق تھی،ٹورسٹ کوچز، ویگنیں، کاریں کاروان..سیاحوں سے بھرے ہوئے، غروب کے منظر کے شیدائی اور سب کے سب ہماری طرح یولارو سے آئے ہوئے..

ہم ایک ''منظر مقام'' پر رُکے جہاں شائقین کا خاصا ہجوم تھا اور اُن میں سے کُچھ رات کے کھانے کے لئے باربے کیو کے انتظامات میں مگن تھے..کُچھ نہ کُچھ بھون رہے تھے..مجھے یہ مقام پسند نہ آیا کہ یہاں سے چٹانوں کے منظر کے درمیان کُچھ شجر اور جھاڑیاں حائل ہوتے تھے..چٹانوں کا کُچھ حصہ روپوش کرتے تھے..اور پھر انسانوں کی گہما گہمی بھی ناگوار گذرتی تھی..

ہم نے اس ''منظر مقام'' کو ترک کیا اور پھر واپس شاہراہ پر آ گئے..وہاں کُچھ مٹرگشت کی بلکہ کارگشت کہہ لیجئے اور پھر ہم نے ایک ایسا مقام تلاش کر لیا جہاں کوئی نہ تھا، کاٹاٹوٹو چٹانیں اتنی نزدیک تھیں کہ ہم اگر اُن کی جانب دو چار گام چلتے، اس شجر سے پرے، سنہری گھاس پر چلتے تو اُن کے دامن تک پہنچ جاتے..محض دو تین منٹ میں، ہم نے اس امکان پر غور کیا کہ وہاں چلے چلتے ہیں لیکن اس میں ایک قباحت تھی کہ غروب کا منظر تو ذرا فاصلے سے دیکھا جاتا ہے..منظر کے اندر جا کر تو نہیں دیکھا جا سکتا کہ پھر آپ بھی منظر کا حصہ ہو جاتے ہیں..

اُس تنہائی میں اُن چٹانوں کی بے مثال پُرشکوہ سُرخ شانداری ہم پر آشکار ہوئی..پہلی نظر میں یوں لگتا تھا جیسے درجنوں ہاتھی اور وہ بھی سُرخ ہاتھی سر جوڑے کھڑے ہیں..کبھی وہ ایک ناقابل تسخیر حصار کی صورت دکھائی دینے لگتیں جس کے اندر جانے کا کوئی دروازہ نہ تھا..

چٹانوں میں سے ظاہر ہوتے چھتیں گنبد سے تھے یعنی یوں جانئے کہ چھتیس ہاتھی سر جوڑے حنوط شدہ سُرخ حالت میں ہیں، ان کی بلندی اولورو چٹان سے دو سو میٹر زیادہ تھی..

کہا جاتا ہے کہ اولورو اور کاٹاٹوٹو چٹانیں دن بھر اونگھتی ہیں، بے جان پڑی رہتی ہیں اور صرف طلوع اور غروب کی ساعتوں میں زندہ ہو جاتی ہیں..

سفید نِسان کار سڑک کے کنارے کھڑی تھی..اُس کی ونڈ شیلڈ پر بھی چٹانوں کی سُرخی عکس ہو رہی تھی..

مجھے افسوس ہوا کہ میری سُرخ آنکھوں میں سے جنم لینے والی سُرخ بادبانوں والی سب کی سب

کشتیاں اولورو چٹان کے کناروں پر لنگر انداز ہو چکی تھیں، کاش کہ میں اُن میں سے ایک کشتی سنبھال کے رکھتا اور اُسے کاٹاٹوٹو کی جانب رواں کر دیتا..میرا جی چاہا کہ میں اپنی تھکن کے باوجود ہمت کر کے اُن کے قریب پہنچ جاتا، کاٹاٹوٹو چٹان پر اپنا ہاتھ رکھ کر، ہتھیلی جما کر لوٹ آتا تا کہ وہ گواہ ہو جاتی..وہ کم از کم ساٹھ ہزار برس سے وہاں موجود تھیں اور اگلے ساٹھ ہزار برس تک بھی اُنہوں نے کہیں آنا جانا نہ تھا، وہاں موجود رہنا تھا..تو آج سے ساٹھ ہزار برس بعد جب باقی رہے نام اللہ کا کچھ بھی جو کچھ آج ہے باقی نہ رہے گا، ہماری سرزمینیں غرق ہو چکی ہوں گی..سمندر خشک ہو چکے ہوں گے، صحرا ڈوب چکے ہوں گے لیکن یہ چٹانیں موجود ہوں گی تو وہ گواہی دیں گی کہ.. ہاں آج سے محض ساٹھ ہزار برس پیشتر یہاں ایک جہاں گرد بوڑھا آیا تھا اور اُس نے ہم پر اپنا ہاتھ رکھا تھا..اب یہ میرا ہاتھ بابا گورو نانک کا ہاتھ نہ تھا جس کا پنجہ اُن چٹانوں میں ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا، میری موجودگی کو ثابت کرتا..لیکن چٹانیں گواہی دیتیں کہ ہاں وہ یہاں آیا تھا..

دھوپ سمٹنے لگی، سائے طویل ہوتے گئے اور پھر کاٹاٹوٹو چٹانوں پر سورج غروب ہوا تو گویا اُن کی سُرخی دہکنے لگی..ایک سُرخ آتش تھی جس کے بھڑکنے سے ہماری آنکھیں جھلسنے لگیں..اُن پر آخری کرنیں اتر کر رخصت ہوئیں تو وہ ایک کوہ طور کی صورت سُرخی میں ڈوب گئیں..

یہ ایک منظر نہ تھا، ایک سُرخ معجزہ تھا..

آسٹریلیا کے صحراؤں کی وسعتوں کے درمیان میں نہ صرف انانگو لوگوں کے لئے بلکہ ہم جیسے اجنبیوں کے لئے بھی وہ سُرخی میں دہکتا منظر ایسا تھا کہ اگر ایمان کا امتحان نہ ہوتا تو ہم سجدے میں گر جاتے..

کیا میں مبالغے کا مرتکب ہو رہا ہوں..ہرگز نہیں اگر میں مبالغہ کروں تو کُفر کا مرتکب ہوں..

ہم تینوں جُدا جُدا..سحر زدہ..سحر زدہ..مبہوت...حنوط.. بُت بنے..یہ کیسا سُرخ جہان تھا جس کے کناروں پر ہم زائر کھڑے تھے..نہ صرف آنکھوں میں بلکہ ہمارے چہروں پر بھی اُن چٹانوں کی سُرخ آتش دہکتی تھی..ہم یوں سرتاپا اُس سُرخی کے عکس میں ڈوب چکے تھے کہ اگر ہمیں کاٹاٹوٹو چٹانوں میں منتقل کر دیا جاتا تو ہم بھی کاٹاٹوٹو کا ایک حصّہ ہو جاتے، ہماری شناخت ہی نہ ہو سکتی کہ اُس ڈھلوان پر جو تین سرخ پتھر ہیں وہ ہم ہیں..ہم اُن میں مدغم ہو کر اُن کے وجود میں شامل ہو جاتے..

ہمیں بہرطور اس سُرخ حیرت بھری سحر انگیزی سے آزاد ہو کر واپس جانا تھا..تو ہم اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر مدہوشی سے ہوش میں لائے، کاٹاٹوٹو کے سُرخ جہان کے سلگتے انگاروں سے جُدا ہوئے..چشم پوشی اختیار کی،

اگر چشم چٹانوں پر رہنے دیتے تو واپس کیسے ایک نابنیائی میں سفر کرتے..

اور جب ہم اُن چٹانوں سے مُنہ موڑ کر چل دیئے..تب یکدم مُونا نے خاموشی کا روزہ توڑ کر دوہائی دی ''رُکو..سلمان رُکو..''

سلمان نے بریک پر پاؤں رکھ دیا ''بھرجائی کیا ہوا ہے؟''

اُس کا خیال تھا کہ یہ عمر رسیدہ بھرجائی مزید حواس کھو بیٹھی ہے اور یا پھر اس کے قلب میں یکدم کُچھ خلل واقع ہو گیا ہے..

''چاند..'' مُونا نے مسکرا کر کہا..

ہم کار سے باہر آ گئے..

کاٹا ٹوٹو کے چٹانی چہروں پر ابھی تک غروب کی سُرخی ٹھہری ہوئی تھی اور ان کے درمیان دو چٹانوں کے درمیان جو ایک شگاف تھا اُس میں سے چودھویں کا چاند ابھر رہا تھا..

شائد یہ مُونا کی اب پژمردہ ہو چکی سیاہ آنکھوں کی تتلیوں کا کمال تھا کہ صرف اُسے وہ چاند ابھرتا نظر آ گیا تھا..

ہم ابھی آزاد ہوئے تھے اور پھر سے گرفتار ہو گئے تھے..

کاٹا ٹوٹو چٹانوں کے عین درمیان میں سے، چودھویں کا چاند ایک روشن تھال کی مانند ابھر رہا تھا..

وہ ایک ایسا روشن چھاج تھا جسے محبوب کی آمد پر بتاشوں سے بھر کر گاؤں کے لوگوں میں بانٹا جاتا ہے..

میں چھج پتاسے ونڈاں، اَج قیدی کر لیا ماہی نُوں..

وہ روشن تھال، وہ چھاج چودھویں کے چاند کا..ہماری نظروں کے سامنے ہولے ہولے بُلند ہو رہا تھا یہاں تک کہ وہ چٹانوں کی آغوش سے جُدا ہو کر نیلے آسمان کا روشن زیور ہو گیا..

شائد ہرگز نہیں، یقیناً آسٹریلیا میں جتنے بھی شب و روز گذرے تھے، جتنے بھی منظر گذرے تھے یہ اُن سب میں سے زیادہ دل کو مسرت اور اداسی سے بھر دینے والا منظر تھا..

ہم دیر تک دیکھا کئے..

کُچھ نے کہا یہ چاند ہے، کُچھ نے کہا، چہرہ ترا..

کس کا چہرہ..

کاٹاٹوٹو کی شفق سُرخی میں سے ابھرنے والے چاند سے کیسے کیسے بھُولے بسرے گیت گئے زمانوں کے دھندلکوں میں سے ظاہر ہونے لگے..

ے یہ چاند یہ چاندنی پھر کہاں. سُن جا دل کی داستاں..

ے چاند جب بھی تو مسکراتا ہے دل مرا ڈوب جاتا ہے..

ے چاند ہنسے دنیا بسے، روئے میرا پیار رے..

ے تُو مرا چاند میں تری چاندنی..

ے چندا رے چندا، کبھی تو زمیں پر آ. بیٹھیں گے باتیں کریں گے..

ے چاندنی رات میں اکیلی..

ے چن ماہی آ.. تیری راہ پئی تکنی آں..

ان گیتوں کے بے مثل شاعر ظاہر ہے کبھی کاٹاٹوٹو تو نہ آئے تھے اور چودھویں کی شب کو تو ہرگز نہ آئے تھے اور اس کے باوجود اُنہوں نے جو کچھ بیان کیا.. وہ میں بیان نہیں کر سکا.. اگرچہ میں کاٹاٹوٹو کی چودھویں کی شب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا..

ے آج تنہائی کسی ہمدم دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے میری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور جھلکنے لگے تیرا عکس ہر سائے تلے..

ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا.. چاند سے بے وفائی کا سفر اختیار کیا..

ویسے بھی جو آوارہ مزاج اور جہاں گرد ہوتے ہیں اپنی سرشت میں ہرجائی اور بے وفا ہوتے ہیں.. وہ کسی ایک جھیل، ایک چہرے، ایک منظر سے وفا نہیں کرتے، کُوچ کر جاتے ہیں.. سخت ہرجائی ہوتے ہیں.. واپسی پر جب اولورو چٹان کے دامن میں اُس شب گذرے تو اُس پر ایک نگاہ بھی نہ کی.. ہم کہیں اور مر مٹے تھے..

ڈلارا کے نخلستان میں پہنچے..کار پارک کی، اپنے گھر گئے، فریج میں سے سٹرابیری ذائقے والا گاڑھا اور شیریں دودھ جی بھر کے پیا اور پھر واش رُوم میں جا کر اپنے آپ کو شاور کی آبشار سے خوب بھگویا..دیر تک بھگویا اور بدن میں جتنی دھوپ، خشکی اور پیاس تھی اُسے سیراب کیا..

کیا یہ میرا شائبہ تھا، شاور کے پانی میرے بدن کو بھگوتے جب فرش پر گرتے تھے تو اُن میں ایک نیم سُرخی تھی جو گھلی ہوئی تھی..

کاٹاٹوٹا کے غروب کی سُرخی کے ذرّے میرے بدن کے اندر سرائت کر گئے تھے جواب واش رُوم کے فرش پر گرتے اُسے بھی سُرخ کرتے تھے..

○○○○○

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

''سرخ بادبانوں والی کشتیاں پاکستان کی جانب رواں ہوتی ہیں..کون ہو تم؟''

اُس شب میں نے تنہا اور لاچار کھڑے بوڑھے ابورجنل شکاری کو خرید لیا..

اُس کا سُتا ہوا بدن جو صرف ایک لنگوٹ میں نمایاں ہوتا تھا، تانبے کی رنگت کا تھا..سر کے گھنگھریالے بالوں اور بے ترتیب داڑھی میں سفیدی کی ریکھائیں تھیں..اُس کے ہاتھ میں ایک آراستہ بُوم رینگ تھا اور آنکھیں سفید پُتلیاں تھیں جیسے اُس نے شکار کو دیکھ لیا ہو..

میں نے جُھک کر اُس کے بوڑھے چہرے کو غور سے دیکھا تو وہ مجھے نوحہ کناں لگا..اُس کی سفید ہوتی آنکھوں میں ایک فریاد تھی کہ دیکھو میں کبھی اپنی ان آبائی سرزمینوں پر ایک پُرفخر شہزادہ ہوا کرتا تھا، مجھ ایسا بوم رینگ پھینکنے والا ماہر اولورو چٹان کے آس پاس جہاں سورج نکلتا تھا اور وہاں تک جہاں یہ ڈوبتا تھا اور کوئی نہ تھا..میرا بُوم رینگ شکار کو ڈھیر کر کے واپس میرے ہاتھوں میں آجاتا تھا اور میں اطمینان سے شکار کا ندھے پر ڈال کر اولورو چٹان کے دامن میں آجاتا تھا، میرا نشانہ کبھی خطا نہ ہوا..میں ایک باعزت بزرگ تھا کہ اولورو مجھ پر مہربان تھی، میں شکار کو الاؤ پر بھونتا، خود بھی کھاتا اور اپنے خاندان کو بھی شریک کرتا اور پھر میں گئی شب اپنے بچّوں اور اُن کے بچّوں کو اپنے قدیم خوابوں کے بارے میں بتاتا کہ یہ خواب ہیں جو ہماری تہذیب کے گواہ ہیں، خواب دیکھو اور اُن کے اندر جو خواب ہیں اُن تک رسائی حاصل کرو..اور پھر یہ بدرنگ پھیکی رنگت والے لوگ آئے اور ہمارے خوابوں کو منتشر کر کے ہم پر اپنے اور وہ بھی پھیکے خواب مسلّط کر دیئے..اور مجھے مختصر کر کے اس شوکیس میں فروخت کرنے کے لئے سجا دیا..وہ نوحہ کناں تھا، فریاد کرتا تھا، مجھے خرید لو..

لکڑی سے تراشیدہ وہ چھ انچ قامت کا بوڑھا ابورجنل شکاری میں نے خرید لیا..وہ آج بھی میری کتابوں کے ایک شیلف میں 'بُوم رینگ تھامے کھڑا ہے، راتوں کو جب میں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں روشن

ہوتے سفید کاغذوں پر جھکا آسٹریلیا کے سفر کی روئداد تحریر میں لا رہا ہوتا ہوں تو وہ اپنی سفید آنکھوں سے مُجھے دیکھتا ہے، کیا تم میرے بارے میں کُچھ لکھ رہے ہو کہ مُجھ پر کیا گذری، اپنی ہی سرزمین پر کیسے میری قامت مختصر کر کے، مُجھے ایک بالشتیا بنا کر لکڑی کے ایک مجسّمے میں بدل دیا گیا.. کیا تم میرے بارے میں بھی کُچھ لکھ رہے ہو..

ہم نے حسب معمول ''گیگ کیفے'' میں کھانا کھایا.. اور پھر سفید نسان پر سوار ہو کر ڈولارا قصبے سے نکل کر اُس پراٹدتا ہوا جو سُرخ صحرا تھا اُس کی شب میں چلے گئے.. اور ہم تو اُسے فراموش کر چکے تھے لیکن اُس نے یکدم ونڈ سکرین پر ظاہر ہو کر ہمیں دم بخود کر دیا.. چاند کا بجھتا ہوا زرد تھال اُس قدیم آسمان کو اپنے روشن وجود سے بھرتا تھا.. اُس کی روشنی کا حُسن بیمار ہمارا محبوب ہونے لگا.. چاندنی اس قدر چاندنی.. پہلے تو کبھی آنکھوں نے نہ دیکھی تھی.. اور یہ چاندنی سڑک پر بھی بچھی جاتی تھی، ہمارے پاؤں تلے آتی تھی، پامال ہوتی تھی.. جیسے سکردو سے خپلو جاتے ہوئے ہم خوبانی کے درختوں کے ایک جُھنڈ میں سے گذرے تو کچّے راستے کو پکی ہوئی زرد خوبانیوں نے اس قدر ڈھانپ رکھا تھا کہ راستہ نظر نہ آتا تھا، ایک زرد قالین بچھا ہوا نظر آتا تھا جس پر ہماری جیپ کے ٹائر انہیں کُچلتے روندتے چلے گئے تھے.. اور ٹائروں کی گذرگاہ کے گھاؤ، جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے تو بائی پاس آپریشن کے بعد جیسے چھاتی پر ایک گھاؤ نظر آتا ہے ویسے نظر آتے..

یہاں ہم راستے پر بچھی چاندنی سے بھی یہی سلوک کرتے تھے، اسے روندتے چلے جاتے تھے..

پر اس پندرہویں کے چاند میں چاندنی کے بہت ذخیرے تھے، وہ اُس گھاؤ کو بھرتے جاتے تھے جو ہماری کار کے ٹائروں کے گذرنے سے وجود میں آتے تھے..

چاندنی کے بہت ذخیرے تھے..

OOOOOO

چاند نگر سے واپسی پر میں نے سڑا بری ذائقے والے دُودھ کی ایک بوتل حلق میں ایک جھرنے کی مانند اُتاری اور اپنی خواب گاہ کو جانے کو تھا جب سلمان نے کہا ''سَر جی کل کا کیا پروگرام ہے..ہم نے کل پچھلے پہر سڈنی لوٹ جانا ہے..اگر آپ ہمت کریں، کل صُبح پانچ بجے بیدار ہو جائیں تو ہم اپنی کار پر سوار اولورو چٹان پہنچ کر اُس پر طلوعِ آفتاب کا نظارہ کر سکتے ہیں..''

''یہ نظارہ تو ہم دیکھ نہیں چکے؟''

''نہیں سَر..ہم نے الورو چٹان پر غروب کا منظر دیکھا تھا، طلوع کا نہیں..''

''تو ان میں کُچھ زیادہ فرق تو نہیں ہوتا..اور سُنو میں اب اس اولورو چٹان سے بیزار ہونے لگا ہوں..یہ بہت ہو گئی..جیسے ایک محفل میں علامہ اقبال کی دُختر نصیرہ.....کی موجودگی میں فریدہ خانم نے پے در پے حضرتِ علامہ کا کلام گایا اور ایسے گایا کہ جیسے صرف فریدہ خانم ہی گا سکتی ہیں تو دختر اقبال سے بالآخر ضبط نہ ہو سکا اور اُنہوں نے ایک جمائی لے کر کہا ''فریدہ جی، ابا جی بہت ہو گئے، اب ذرا وہ پنجابی گیت سنا دیں، جُتی قصوری.....'' تو الورو بھی ابا جی کی مانند بہت ہو گئی..

سلمان اول تو سنجیدہ نہیں ہوتا اور جب ہو جائے تو بہت ہو جاتا ہے..''سَر طلوع اور غروب میں بہت فرق ہوتا ہے..غروب میں اداسی ہوتی ہے کہ اُس کے بعد تاریکی ہوتی ہے جب کہ طلوع میں خوشی ہوتی ہے کہ اس کے بعد روشنی ہوتی ہے..''

''مُونا..'' اور وہ ابھی سے نیند میں اتر رہی تھی ''تم چلو گی، اولورو چٹان پر طلوع کے منظر دیکھنے کے لئے..''

''نہیں..'' اُس نے بیزاری سے کہا..''آخر ایک بندہ کب تک ایک چٹان دیکھے..تم ہو آنا..''

اُس شب نیند میری سُرخ آنکھوں سے حجاب کرتی رہی..

ہمارے گھر کے برآمدے میں کُچھ سرسراہٹیں تھیں، جانے کیا کیا رینگتا تھا، عجیب سی آوازیں آتی تھیں..جھینگر تھے، مکڑے یا بچھو تھے، چھپکلیاں تھیں یا ہزار پائے تھے، کُچھ نہ کُچھ رینگتا تھا..

شائد اُس بوڑھے اور جنگل کا بالشت بھر کا مجسمہ زندہ ہو گیا تھا..

○○○○○

سب جگ سوئے، ہم جاگیں، چاندنی راتیں..

سب جگ سو رہا تھا جب ہم جاگے..

میں اور سلمان جاگے..

نیم تاریکی میں خوابیدہ سُرخ صحرا تھا جس کے درمیان میں ہم ابھی تک نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ سفر کرتے تھے..

بہت دُور..الورو چٹان کی سُرخ شباہت بھی خوابوں کی غنودگی میں تھی..میں نے کھڑکی کا شیشہ کھسکا کر نیچے کیا تو سویر کی ٹھنڈک میں اولورو کی سُرخ گھلی ہوئی تھی..

ہم اب اُس کے پہلو سے لگے، اُس کے دامن میں سفر کرتے تھے..اُس کے سنگلاخ سُرخ چہرے پر جو دراڑیں اور جھرّیاں تھیں وہ لگتا تھا کہ ایک خواب سے بیدار ہو رہی ہیں..

اور وہاں ایک ڈر تھا..

ہمارے سوا اُس بڑے سناٹے میں کوئی اور مسافر نہ تھا..

کیا جانئے ابورجنل لوگ سچ ہی کہتے ہوں کہ یہ چٹان آسمانوں سے اتری ہو تو وہ ہمیں اسیر کر سکتی تھی، مجبور کر سکتی تھی کہ مجھے مقدس جانو، اپنا عقیدہ ترک کر کے ابورجنل ہو جاؤ، مجھے ایک حجرِ اسود جان کر بوسہ دو..ہمارے لئے یہ بہتر ہی ہوا کہ آج پچھلے پہر ہم نے اس کے سُرخ سحر سے فرار ہو کر سڈنی پرواز کر جانا تھا ورنہ کیا پتہ ہم بے ایمان ہو جاتے..ابورجنل لوگوں کے خوابوں پر ایمان لے آتے..اور وہاں پہنچے ہیں جہاں طلوع کا ایک ''منظر مقام'' بلندی پر آویزاں ہے تو وہاں ایک میلہ لگا ہوا ہے..

یہ نہیں کہ سب جگ سو یا رہا تھا اور صرف ہم جاگے..بلکہ سب جگ ہی جاگا ہوا تھا اور اولورو چٹان پر طلوع کا منظر دیکھنے چلا آیا تھا، ٹورسٹ بسیں، کاریں، ویگنیں، کوچز پارکنگ لاٹ میں ہم سے بہت پہلے پارک ہو چکی تھیں..

اس میلے کی ایک خصوصیت تھی کہ اس میں دھوم دھڑکا اور شور وغُل نہ تھا، میلہ خاموش تھا..سب کے

سب زائرین چُپ تھے..خاموشی سے چلتے جاتے تھے اور اُس بلند ''منظر مقام'' کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے تھے جہاں سے اولورو چٹان پر ابھرتے سُورج کا بہترین نظارہ دکھائی دیتا تھا..

ہوا میں خنکی تھی اور وہ بھی سُرخ رنگت کی تھی..

نہ صرف آسٹریلوی بلکہ دنیا بھر سے آنے والے سیّاح..شوخ چلبلی جاپانی لڑکیاں، امریکی اور یورپی بوڑھے، کُچھ مکمل خاندان، اپنے بچّوں کو تیز چلنے کی تلقین کرتے ہوئے، شیر خوار بچّوں کو گود میں اٹھائے ہوئے..سب کے سب رواں دواں..اور خاموش..

''سر جی..لگتا ہے یہ لوگ عید کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں..''

وہاں دنیا بھر کے چہرے تھے پر اُن میں سے کوئی ایک چہرہ ہم جیسا نہ تھا..ہم اُس طلوع کے اشتیاق میں مبتلا لوگوں میں واحد پاکستانی تھے..

میرا جی چاہا کہ میں ہر سیّاح سے مخاطب ہو کر کہوں کہ دیکھو میں ایک پاکستانی ہوں..میں سات سمندر پار کر کے آسٹریلیا آیا ہوں اور پھر طویل فاصلے طے کر کے آج سویرا اولورو چٹان پر طلوع کا منظر دیکھنے آیا ہوں اور میں پاکستانی ہوں.. مُجھ سے مت ڈرو.. بے شک میں ایک ناکام ریاست کا باشندہ ہوں جہاں عقیدے کے نام پر سکول جانے والی بچّیوں کو جلا دیا جاتا ہے اور اگر کوئی ایک ملالہ بچ جائے، کلاشنکوف کی گولیاں اُس کا چہرہ بگاڑ دیں تو اُسے ایک غدار اور فاحشہ قرار دیا جاتا ہے، جہاں معصوم لوگوں کے بدنوں کے لوتھڑے درختوں پر سُرخ ہوتے ہیں اور میرے وطن کا دفاع کرنے والے فوجیوں کو ''اللہ اکبر'' کے نعروں کے ساتھ ہولے ہولے ذبح کیا جاتا ہے، اُن کے سر کھمبوں پر لٹکائے جاتے ہیں اور ہمارے اپنے صحافی اور مذہبی راہنما، جو لوگ اُنہیں ذبح کرتے ہیں، اُنہیں شہید قرار دیتے ہیں اور جو ذبح کئے گئے اُن کی موت کو حرام موت قرار دیا جاتا ہے تو براہ کرم میرے وطن کے اُس چہرے کو نہ دیکھو، مُجھے دیکھو، میں پاکستان کی پہچان ہوں، اور بیشتر پاکستانی مجھ جیسے ہیں..دیکھو میں اولورو چٹان پر طلوع ہونے والے سورج کا نظارہ کرنے کے لئے اتنی دور سے آ گیا ہوں.. مُجھے دیکھو..

لوگ منتظر تھے..

دو تین ''منظر مقام'' تھے اور وہاں سینکڑوں سیّاح اولورو چٹان پر نظریں جمائے کھڑے تھے..

جیسے ابھی وہاں کوہ طور کی مانند روشنی ہو گی..

ہوا میں خنکی تھی..ہم نے جیکٹیں پہن رکھی تھیں..

وہاں جتنے بھی چہرے تھے سویر کی ہلکی روشنی میں اُن کا رُخ اولورو چٹان کی جانب تھا، اُن چہروں پر

جتنی بھی آنکھیں تھیں منتظر آنکھیں تھیں.. منتظر تھیں کہ آفتاب ابھرے.. صحرا کے جو نیم تاریک کنارے تھے اُن میں سے ایک مدھم سُرخی پھوٹنے لگی.. جیسے اُن کناروں کی اوٹ میں کوئی الاؤ روشن کر رہا ہو.. پھر یہ مدھم سُرخی ہولے ہولے سرکتی صحرا کی نمود پر بچھنے لگی.. اُسے اپنی سُرخی میں رنگنے لگی... وہ جو سینکڑوں منتظر چہرے تھے اُن کی رنگت بھی بدلنے لگی، اُن پر بھی جیسے حیا کی سُرخی پھیلنے لگی.. اور اس سُرخی میں ابھی تک روپوش سورج میں سے فرار ہونے والی پہلی کرنوں کا سنہرا پن گھلتا جاتا تھا.. جیسے کل شب نیم تاریکی کی چھاؤں چٹان کی جانب سرکتی جاتی تھی ایسے آج سویرے یہ سُرخی میں گھلی ہوئی روشنی تھی جو اُس کی جانب ہولے ہولے.. ایک بنگال ٹائیگر کی مانند دبے پاؤں بڑھتی جاتی تھی.. صحرا کی سُرخ مٹی اُس سُرخی کی آمد سے لال گلال ہوئی جاتی تھی..

اور جب یہ مدھم سُرخی میں گھولی ہوئی کرنوں کی روشنی چٹان کے دامن تک پہنچ گئی تو ایک لمحے کے لئے رُک گئی.. وہ جو سینکڑوں کی تعداد میں اُس پر نظریں جمائے ہوئے تھے اُن کے دل بھی متوقع منظر کے استقبال کے لئے کچھ رُک گئے..

اولورو چٹان ابھی تک نیم اندھیارے میں تھی، اور پھر روشنی کی سنہری کرنیں اُس پر کمندیں ڈالنے لگیں.. ایک کوہ پیما کی مانند روشنی ان کمندوں کے سہارے بہت احتیاط سے اُس کے چٹانی وجود پر چڑھتی گئی، اُسے زیر کرنے کی خاطر اور اُس کی چوٹیوں تک پہنچ گئی.. اولورو چٹان دامن سے اپنی بلند ترین سطح تک روشن ہو گئی..

''تب پانیوں پر ایک دُھند تیرتی تھی، تاریکی راج کرتی تھی..

اور پھر اذن ہوا کہ روشنی ہو جا..

اور وہاں روشنی ہو گئی..''

اور اب اولورو چٹان پر روشنی تھی..

سنہری کرنوں کی کمندیں ڈالنے والی روشنی اُس کی چوٹیوں تک پہنچ گئی تھی..

جیسے نماز نیند سے بہتر تھی تو کسی حد تک اولورو چٹان کا یہ منظر بھی نیند سے بہتر تھا..

نیم خنک شفق سے آلودہ سُرخ موسموں میں ایک خاموشی تھی، صرف سینکڑوں کیمروں میں سے کِلک کِلک کی میکانکی آوازیں لگاتار سنائی دے رہی تھیں.. الورو نے شفق کے سُرخ اور کرنوں کے سنہری دھاگوں سے بُنا ہوا پیراہن پہن لیا تھا، شائد وہ ابھی کچھ دیر پہلے آسمان سے اتری تھی کہ اُس کے چٹانی چہرے پر افلاک کے رنگ تھے..

ویسے میں کچھ دل گرفتہ بھی ہوا تھا، ایک اداس رنج کا شکار ہوا تھا کہ اولورو چٹان جب اندھیروں

کے حجاب میں تھی، اُس کی شکل واضح اور دُھندلی سی تھی تو میرے لئے وہ زیادہ حسین اور دلکشی کے سامان رکھتی تھی..وہ حجاب نہ رہا، نقاب اٹھ گیا، تو وہ بنات النعش کی مانند روشنی میں عریاں ہوگئی..دل کشی اور سحر کے سب سامان اٹھ گئے..حجاب نہ رہے، نقاب اٹھ جاوے، پیراہن اتر جاوے تو ہوس در آتی ہے اور حُسن رخصت ہو جاتا ہے..

وہ جو ایک نیم شب کے بیدار تھے..دیدار کے لئے کشاں کشاں آئے تھے، سینکڑوں شائق تھے..

وہ..جیسے عید کی نماز کے فوراً بعد بکھرتے ہیں، ایسے بکھرنے لگے..

وہ سب مشتاق دیدار، ناظرین، تماشائی رخصت ہونے لگے..

''چلیں سر جی..'' سلمان نے کہا ''آنٹی منتظر ہوں گی..''

''تم چلو..پارکنگ لاٹ میں سفید کار تک پہنچو..میں آتا ہوں..''

سلمان میری کسی منظر کے ساتھ تنہا ہو جانے کی علّت سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ سَر جی پہنچ چکے ہیں اور وہ چلا گیا..

مُجھے قلق ہو رہا تھا کہ میں نے آج اس چٹان سے بچھڑ جانا ہے، پچھلے پہر سڈنی کی جانب پرواز کر جانا ہے اور کل سویر کی فلائٹ پر پاکستان لوٹ جانا ہے..سلمان نے سچ کہا تھا کہ غروب کے منظروں میں اداسی ہوتی ہے کہ اُس کے بعد ایک تاریک شب وارد ہوتی ہے اور طلوع کے منظر آپ کو آس امید سے بھر دیتے ہیں کہ ان کے بعد اندھیرا نہیں روشنی ہے اور اس کے باوجود میرے دل میں غروب کے سائے جنم لیتے تھے..کل تم نے نہیں ہونا اور اس چٹان نے ہونا ہے..تادیر اولورو چٹان پر نظریں جمائے میں ایک سراب کا شکار رہا..اُس کے سُرخ وجود میں جتنی بھی جھُرّیاں دراڑیں، گھاٹیاں، جھرنے، نشیب و فراز اور چٹانی گھاؤ تھے نہ صرف وہ بلکہ اُس کے آگے بچھے ہوئے صحرا کی سُرخ مٹّی میں سے پھوٹنے والے جتنے بھی نایاب بُوٹے، سنہری گھاس اور جھاڑیاں تھیں بلکہ اُن میں ابھی تک پوشیدہ جتنے بھی جانور تھے، رینگنے والی حیات، چھپکلیاں، ٹڈے، بچھّو، ہزار پائے، مکڑیاں، مکوڑے تھے وہ سب بولنے لگے..وہ مجھ سے مخاطب تھے..ان تین ہفتوں میں مُجھ پہ جو گذری تھی اُس کی کہانیاں کہنے لگے..باتیں کرنے لگے..

ooooo

ابھی یہ کل کی بات تھی جب ہم سڈنی ایئرپورٹ پر اُترے تھے..

اور یہ آج کی بات ہے کہ مُجھے یُوں لگتا تھا کہ جیسے میں ہمیشہ سے یہاں ہوں..زمانے گذر گئے تھے اور مُجھے احساس ہی نہ ہوا تھا..

یہ بلو ماؤنٹین کا گھنا اتنا گھنا جنگل تھا کہ طیور اُس پر اتر نہ سکتے تھے..اپنے آشیانے بُھول جاتے تھے..

بلو ماؤنٹین کی تین بہنیں پتھر ہو چکی تھیں..

کینبرا کی ڈھلتی شام میں ایک کنگرو اگلی دونوں ٹانگیں اٹھائے غروب کے منظر میں مُجھے حیرت سے تکتا تھا..اور میں اُسے اپنے پوتے ابراہیم کے لئے پاکستان لے جانا چاہتا تھا..

جہاں سے پُورا کینبرا آپ کے قدموں میں بچھا ہوا دکھائی دیتا ہے،مُونا نے آبدیدہ ہو کر کہا تھا..

''اس شہر میں میرا بھائی رہتا تھا..''

وہ ابھی دو ماہ پیشتر مر گیا تھا اور مُونا کے بھائی مرتے جاتے تھے..

ڈاکٹر احمد شفاعت بے شک مانٹریال کے کسی قبرستان میں دفن ہے لیکن مُجھے اولورو چٹان میں ایک دراڑ دکھائی دے رہی تھی جو اُس کا مدفن ہو سکتی تھی کہ اُس نے اسی سرزمین سے حساب کے مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تو یہ زمین بھی اُس کی حقدار تھی..

کیسی کیسی شکلیں ظاہر ہو رہی تھیں..

وہ جو فراموش ہوتے منظر تھے وہ اولورو چٹان پر ظاہر ہو رہے تھے..

ایک کشتی،میری سُرخ آنکھوں میں سے جنم لینے والی سُرخ بادبانوں والی کشتی اولورو کی جانب

چلی جاتی تھی..

کسی شب میں وہ ایک سفید تتلی تھی، پَر پھیلائے سمندروں میں ٹھہری ہوئی سڈنی آپرا ہاؤس کی سفید عمارت.. کسی بھی لمحے آنکھوں سے اوجھل ہو سکتی تھی.. زمانے گذر گئے جب ایک قدیم ٹاؤن ہال میں، دور دور سے آئے ہوئے لوگ، میری پذیرائی کے لئے آئے ہوئے تھے.. میں گدھوں کے بارے میں ایک تحریر پڑھتا تھا تو وہ ہنستے تھے اور جب میں ''غار حرا میں ایک رات'' سے ایک اقتباس سناتا تھا تو وہ آبدیدہ ہوتے تھے.. جاوید نظر کا کہنا تھا کہ سڈنی کی تاریخ میں آج تک اتنا بڑا اجتماع کبھی نہ ہوا.. اگرچہ میں ذلت کے لائق تھا لیکن رب کعبہ نے مجھے عزت سے سرفراز کیا..

اولورو چٹان اب مکمل طور پر ظاہر ہو چکی تھی، کرنوں کے بجائے دھوپ میں عیاں ہو رہی تھی..
وہاں کیسے کیسے قدیم خواب دفن تھے.. احمد شفاعت دفن تھا..

اور پھر ڈاکٹر سعید خان کے گھر کی وہ بالکونی تھی جس کے نیچے ایک دریا بہتا تھا اور اُس میں بادبانی کشتیاں رواں ہوتی تھیں.. کیسے کیسے دیدہ زیب، خوش لباس، خوش نظر لوگ میری چاہت میں چلے آتے تھے..
یہ عرش پر ایک مکان تھا جو مجھے پسند آ گیا..

وولوگانگ کی ایک شب تھی جب چٹانوں میں سے، ایک شگاف میں سے سمندر کے پانی ایک آبشار کی صورت چھوٹتے، آپ کو بھگوتے تھے..

سکھدیپ کے گھر کی دوست آسائش.. گئے زمانوں کی دُھند میں بھٹکتے ہم دونوں..
''اوئے چوہدری ہم نے دوبارہ نہیں ملنا.. دن تھوڑے رہ گئے ہیں..''

سلمان کا گڑیا گھر جہاں اُس کے جڑواں بیٹے احمد اور حسن مجھ سے پہچانے نہ جاتے تھے اور اُس کے گھر کے عقب میں جو شجر تھے وہاں رنگین طوطے روپوشی میں چہکتے جاتے تھے..

صحرا کی رات میں ہم ''خاموشی کی آوازیں'' سنتے تھے اور اولورو چٹان بہت دور غروب کے منظروں

سے آگے تاریکی میں ڈھل چکی تھی..

''میں اپنی ناآسودہ خواہشوں کو صندوقچیوں میں بند کرتی گئی، اُنہیں محفوظ کرلیا کہ جب مجھے فرصت ہوگئی تو انہیں کھولوں گی..''

کنگرو حلال ہے..مگر مچھ کیسے حلال ہوسکتا ہے.. پانیوں کی مخلوق ہے، حلال ہی ہوگی..

''اَج چن تارے نیویں لگدے نیں..''

ایک گرتے ہوئے ستارے کو سنبھال لو..

ہمارے دامن گرتے ہوئے ستاروں سے بھر گئے..اُن کی سلگاہٹ سے ہمارے دامنوں میں چھید ہو گئے..

زمین میں سے پھوٹنے والے بُوٹے بُوٹ نہیں پہنتے، ننگے پاؤں رہتے ہیں..

ابھی کل شب کے ہی تو چرچے ہیں جب کاٹا ٹوٹا چٹانوں کی گھاٹیوں کے درمیان میں سے چودھویں کا چاند ابھرا تھا..ایک روشن چھاج جو بتاشوں سے بھرا ہوا تھا.. جب میں دنیا کے طویل ترین برفانی راستے بیافو ہیپر گلیشیروں کی پُرمرگ مسافتوں کے بعد ایک جیپ پر سوار کریم آباد اترا تھا تو ہم سب نیم وحشی ہو چکے تھے..

ویرانوں، برفوں اور تنہائیوں کے پالے ہوئے، کُچھ جانور سے ہو گئے تھے..ہم ایک تہذیب یافتہ معاشرے سے سمجھوتہ نہ کر سکے تھے، کُچھ ایسے ہی میں واپسی کے خیال سے خوفزدہ ہوا جاتا تھا..

''میں نئیں جاناں، کھیڑیاں دے نال''

مجھے تہذیب اور آبادیوں میں لوٹ جانے کے خیال سے وحشت ہوتی تھی..

کہہ لیجئے کہ میں اس مختصر قیام کے دوران، اس سُرخ صحرا میں چند روز بسر کرنے کے بعد..اس کے ماحول اور کائناتی تنہائی کی سُرخی میں ایک نیم وحشی، ایک ابورجنل ہو چکا تھا، لوٹنا نہ چاہتا تھا..یہیں کہیں آباد ہو جانا چاہتا تھا..لیکن اس سرزمین پر میرا کُچھ دعویٰ نہ تھا، کوئی حق نہ تھا..میں کیسے یہاں ٹھہر سکتا تھا، مجھے آج دوپہر بہرطور سڈنی کے جہاز پر سوار ہوکر اس سُرخ دھرتی کو چھوڑ جانا تھا..

مجھے الوداع کہنے کی خاطر کوئی بھی نہ آیا..صرف ایک ابورجنل بچہ ننگے پاؤں چلا آیا..اور اُس کے بھورے بالوں تلے جو روشن آنکھیں تھیں وہ مجھ سے سوال کرتی تھیں..

''کون ہو تم..جو ہمارے ساٹھ ہزار برس کی تنہائی میں..
مُخل ہو گئے ہو..
ہم نے تمہیں کوئی سندیسہ تو نہیں بھیجا تھا کہ..
ہمارے ساحلوں پر آ اترو..
ماؤں کی گود خالی کر دو..
درختوں کی جڑیں کاٹ ڈالو..
جان لو کہ تمہاری تہذیب اور رہن سہن تو
ابھی کل کا قصہ ہے..
جب کہ ہم ساٹھ ہزار برس سے اس سرزمین کے وارث ہیں..
تم تو اگلے ایک ہزار برس میں ہی تھک جاؤ گے..
پسپا ہو جاؤ گے..
اور ہم سفر کرتے رہیں گے..
کون ہو تم..
جو ہماری ساٹھ ہزار برس کی تنہائی میں..
مُخل ہو گئے ہو..

○○○○○